مُحبّی

محمد طفیل

مضمون لکھنے کا ایک انداز تو
یہ ہے کہ وہ اتنا سچّا ہو کہ
پڑھنے والا اُسے جھُوٹ ہی جھُوٹ
جانے !
ایک انداز وہ ہے کہ وہ اتنا
جھُوٹا ہو کہ پڑھنے والا اُسے
سچ ہی سچ سمجھے !
میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ
مَیں نہ ایسا سچ بول سکتا ہوں
اور نہ ایسا جھُوٹ !

محمد طفیل

مجتبیٰ

محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

بار اوّل ——— جنوری ۱۹۸۱ء

خطاطی ——— عبدالمتین

سرورق ——— مُوجد

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اُردو لاہور سے شائع کی۔

ترتیب

میرے نزدیک!

خاکہ نگاری خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے

یعنی جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہو، اُس کے عین مین اظہار

کا نام خاکہ نگاری ہے!

محمد طفیل

اعتراف

لکھنا اور لکھتے رہنا، میرا مقدر بن چکا ہے۔ مگر ایسا وقت کم ملتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے بھی چند سطریں لکھ سکوں۔ اگر مجھے اپنی مرضی سے چند سطریں لکھنے کی مہلت مل سکتی تو آج میرا بہت سا لکھا آپ کے سامنے ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ جب میں لکھتا رہتا ہوں تو پھر اپنی مرضی سے چند سطریں کیوں نہیں لکھ سکتا؟ یہ سوال ٹھیک ٹھاک قسم کا ہے مگر میں اس کا ٹھیک ٹھاک جواب نہیں دے سکتا۔

یہ میری ساتویں کتاب ہے۔ میں نے خاکہ نگاری کو "الف" سے شروع کیا تھا یعنی میری ابتدائی کتابوں کے نام حروفِ تہجّی کے ابتدائی حروف تھے۔ مثلاً آپ، جناب، صاحب، وغیرہ! خاکہ نگاری کے کام کو، میں جس حد تک نبھا سکتا تھا۔ اُسے شاید نبھا ہی ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ اب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے جو کچھ لکھنا تھا۔ جس پیرائے سے لکھنا تھا۔ وہ کچھ اور ویسا کچھ لکھ چکا ہوں۔ اسی سوچ نے مجھے مجبور کیا کہ آپ سے عرض کروں کہ جناب میں نے جس کام کو "الف" سے شروع کیا تھا۔ اُسے "ی" تک پہنچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میری اس کتاب کا نام "مجی" ہے ہو سکتا ہے کہ ایک مجموعہ اور "مخدومی" کے نام سے بھی سامنے آسکے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں تاکہ آپ کے قلمی لٹھ ہوا ہی میں معلّق رہیں، کیونکہ بندہ رفیع نثر کا قائل ہے۔ وہ یہ کہ میں نے فن کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا۔ بلکہ عرض یہ کیا ہے کہ منصوبے کی حد تک، میں نے جس کام کو "الف" سے شروع کیا تھا۔ اُسے اپنے تئیں اور اپنی بساط کے مطابق "ی" تک پہنچا دیا۔ بھلا فن کی تکمیل کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ جو میں ایسی خطا کا مرتکب ہوتا!

ایک دفعہ ایک بڑے ادیب نے لکھا کہ فلاں مضمون میں، زیرِ بحث شخصیت کے طویل مکالموں نے خاکہ کے حُسن میں کمی کر دی ہے۔ میں یہ جان کر خاصا حیران ہوا۔ جتنا حیران ہُوا اس سے زیادہ خوش ہوا۔ کیونکہ زیرِ بحث شخصیت کو اُجاگر کرنے کے لیے، میں نے مکالموں کو وسیلہ بنایا تھا۔ مکالمے ممدُوح کے نہ تھے۔ بلکہ شخصیت کے لبُ و لہجہ میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ خاکہ نگاری میں اس سے زیادہ کامیابی کا کیا تصوّر ہوگا کہ الفاظ میں شخصیت مُتکلّم نظر آئے۔ بہر حال شخصیت مُتکلّم نظر آئے یا نہ آئے ایسے مکالموں کو میرے ہی گناہوں میں شمار کرنا چاہیے۔

میری خاکہ نگاری سے چند دوست ناخوش ہوئے۔ معذرت خواہ ہوں۔ چند شخصیتوں نے سراہا، شکر گزار ہوں۔ بہر حال اپنی تحریر کے ضمن میں، مَیں تو اتنا کچھ کہہ سکتا ہوں کہ چہرہ نمائیوں میں میرا قلم بے ایمان نہ تھا۔ میرا قلم رسائی کی کوتاہی کا شکار ہوا ہو تو وہ مسئلہ الگ ہے۔

ایک عجیب سی بات ذہن میں آئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خاکہ نگار صرف چار لفظوں کی زد میں ہوں۔ وہ چار لفظ یہ ! " روکو مت جانے دو "! اب کون لفظ روکو کو باقی فقرے سے الگ کرتا ہے اور کون دو لفظوں (روکو مت) کو، مثال پامال سہی، مگر واقعہ یہی ہے کہ خاکہ نگاری کچھ ایسے ہی لفظوں کا کھیل ہے۔

میں نے کیسا لکھا ؟ اس کے بارے میں آپ کی رائے ہی معتبر گردانی جائے گی۔ ہر چند کہ میری خاکہ نگاری کی پسندیدگی کے بارے میں نیاز فتحپوری ایسے ادیب نے انتہائی کلمات کہہ دیئے۔ اس کے باوجود، اچھا لکھنے کی تمنّا آج بھی ہے۔ مگر اچھا لکھنا بہت مشکل نکلا۔

محمّد طفیل

۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۰ء

بہرِ ملاقات

"یہ تقریر میں نے رائٹرز گلڈ کے ۲۰ ویں سالانہ جلسہ کی تقریب میں، بہ حیثیت سیکرٹری جنرل کی تھی۔ چونکہ اس تقریب کا تعلق ادب اور ادیب سے ہے اس لیے اسے درج گزٹ کیا جا رہا ہے۔ جلسہ مرکزی وزیر تعلیم جناب محمدؐ علی خان ہوتی کی صدارت میں ہوا تھا۔"

گرامی قدر وزیرِ معارف اور اہلِ قلم ساتھیو!

اس وقت میرا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ میں وزیرِ معارف کا شکریہ ادا کروں مگر شکریہ کے ایسے الفاظ تو آپ آئے دن، مختلف تقریبات میں سنتے ہی رہتے ہیں۔ میں اُس تعداد میں کیا اضافہ کروں؟ بہر حال اہلِ قلم آپ کا دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

میرا دوسرا فرض، اپنے اہلِ قلم دوستوں کا شکریہ ادا کرنا ہے اور میں یہ فرض ادا نہیں کر رہا۔ اس وجہ سے نہیں کہ ادا کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس وجہ سے کہ ادا کر ہی نہیں سکتا۔ صرف ایک بات عرض کروں گا کہ آپ نے مجھے اپنی نمائندگی کا شرف بخشا ہے اور یہ میری زندگی کا بہت بڑا اعزاز ہے۔

یہ تقریب لاہور میں ہو رہی ہے۔ داتا گنج بخش کی نگری میں ہو رہی ہے جہاں علامہ اقبال آسودۂ خاک ہیں، اُس شہر میں ہو رہی ہے۔ مینارِ پاکستان کے جلو

میں ہو رہی ہے۔ اسلامی کانفرنس کی ایک نشانی کے زیرِ سایہ ہو رہی ہے۔

رائٹرز گلڈ کا قیام ۱۹۵۹ء میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ چند ادیبوں نے سوچا کہ اہلِ قلم کی فلاح و بہبود کا بیڑا اٹھانا چاہیے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ہر گوشے سے ادیب اکٹھے ہوئے تھے اور یہ صدا گونجی تھی :-

"ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت بین الاقوامی امن کے آدرش، اور انسانیت کی ترقی کے لیے وقف کرتے ہیں۔"

رائٹرز گلڈ ادیبوں کی ٹریڈ یونین ہے جس کے باقاعدہ انتخابات ہوتے ہیں۔ گلڈ کا ایک آئین ہے جو ہمارے نزدیک پاکستان کے آئین ہی کی طرح مقدس ہے۔ اِس ملک کے عوام کا تو ایک آئین ہے اور ہمارے دو! اور دونوں ہی ہمیں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عزیز ہیں! غرض رائٹرز گلڈ کا عہد نامہ یہ ہے کہ ادب کو بھی زندہ رکھنا ہے اور ادیب کو بھی!

ادیب کا معاشرہ میں کیا مقام ہے؟ اس کا ذکر میں کیوں کروں؟ مراقبے میں جائیے تو دیکھیے کہ سر سیّد احمد خان ایک کونے میں کھڑے ہیں جنھوں نے اپنی دُور اندیشی سے، اس قوم کو جھنجھوڑا اور اوج تک پہنچایا۔ کچھ دُور آپ کو مولانا حالی مل جائیں گے جنھوں نے قوم کو راست بازی اور دردمندی کا درس دیا۔ آگے بڑھیں گے تو آپ کو مولانا محمّد علی جوہر مل جائیں گے جن کے ملّی دم خم سے، انگلستان کے ایوانوں میں زلزلہ آگیا تھا۔ ذرا اور آگے بڑھیں گے تو آپ کو مولانا حسرت موہانی مل جائیں گے جو اپنی سادگی میں بے مثال تھے اور سیاست میں بھی ایمان دار، یعنی سیاست جو ایمان کا بیوپار نہیں، مولانا اُس میں بھی ایمان دار تھے۔

اقبال کا ذکر میں نے دانستہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ نہ صرف ہماری آزادی کے پیغمبر تھے بلکہ ملی فکر کے بھی ناخدا تھے۔ اقبال ہمارے ہی قبیلے کے ایک فرد تھے۔ جس نے پاکستان کی بشارت دی تھی۔

غرض سر سید احمد خاں، مولانا حالی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی اور علامہ اقبال تو ہمارے ہی برصغیر کے ادیب تھے۔ ذرا باہر جھانکیں گے تو شکسپئر، ہومر، ورجل، نیٹشے، گوئٹے، روسو، والٹیئر، ٹالسٹائی اور ٹیگور کے علاوہ محی الدین ابن عربی، امام فخر الدین رازی، امام غزالی، سعدی شیرازی اور مولانا روم کے نام بھی دکھائی دیں گے۔ جنھوں نے اپنی تحریروں سے معاشرہ کو بدل کے رکھ دیا۔ نہ صرف بدل کے رکھ دیا بلکہ ان کی تحریریں ہی انقلابات کا باعث بنیں۔ حکومتیں بدل گئیں۔

اس سے زیادہ ادیب اور اس کی تحریر کی عظمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ خدا بھی یہ کہتا ہے "قسم ہے قلم کی"۔ میرے نزدیک ادیب کا قلم، ایک خدائی عطیہ ہے۔ جسے اس نے ہم ایسے گنہگاروں کو ودیعت کر دیا۔

گالز وردی بھی ایک دوسرے رُخ سے، ادیب اور ادب کے موضوع پر گفتگو کرتا ہے۔

> "کسی جگہ لوگ نہایت آرام اور سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک صاحب کو خبط سوار ہوا۔ اُس نے لالٹین لے کر شہر کی سڑکوں اور گلی کوچوں میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سڑکوں اور گلیوں میں ہر جگہ گندگیاں نظر آنے لگیں۔ اس حرکت سے لوگ بہت خفا ہوئے اور خفا ہونا فطری تھا۔ جہاں انھیں صفائی نظر آتی تھی۔ اب گندگی نظر آنے لگی۔ حُسن کی جگہ بدنمائی نے لے لی۔

جس شہر کو وہ دنیا کا سب سے زیادہ خوب صورت شہر سمجھتے تھے۔
وہ بدنمائی اور گندگی کا گہوارہ نکلا ؛

اس پر لوگوں کا خفا ہونا برحق تھا۔ اس کو پکڑ کر لوگ قاضی کے
پاس لے گئے۔ وہ صاحبِ اقبال جرم کی بجائے یہ فرمانے لگے۔
" میں بے قصور ہوں اور یہ لالٹین بھی بے قصور ہے۔ میں تو صرف
لالٹین لے کر شہر میں چکر لگاتا ہوں۔ لالٹین کی روشنی سڑکوں پر پڑتی
ہے۔ تاریک گوشوں کو روشن کرتی ہے اور اس روشنی میں گندگیاں
جو پہلے سے موجود ہیں نظر آنے لگیں تو اس میں میرا یا اس لالٹین کا
کیا قصور ہے ؟ "

میری سُنیں تو میں یہ کہوں گا کہ ادیب کا معاشرہ میں رول یہ ہے کہ اگر معاشرہ
پھول ہے تو ادیب خوشبو، اگر معاشرہ جسم ہے تو ادب روح، اگر معاشرہ چاند ہے تو
ادب چاندنی !

میں تاریخ دان نہیں ہوں کہ میں آپ کو بتا سکوں کہ فلاں سن میں فلاں بادشاہ
تھا اور فلاں سن میں فلاں بادشاہ۔ چونکہ میرا تعلق ادب سے ہے اس لیے مجھے بادشاہوں
کے ناموں سے زیادہ ادیبوں کے ناموں اور کاموں سے آشنائی ہے۔ میرے نزدیک
وہ بادشاہ تاریخ کے صفحات میں گم ہو جائیں گے جن کا دنیاوی سکّہ چلتا تھا۔ مگر وہ
"بادشاہ" زندہ رہیں گے جن کا قلمی سکّہ چلتا تھا۔

کہنا یہ ہے کہ جن لوگوں نے انسانوں پر حکمرانی کی وہ بادشاہ وقتی تھے۔ جنھوں
نے حکمرانی اپنے قلم سے کی وہ دائمی زندگی پا گئے۔ ساری دُنیا میں غالب کی سو سالہ
برسی منائی گئی۔ ساری دُنیا نے امیر خسرو کی چھ سو سالہ برسی منائی۔ ساری دُنیا میں علامہ اقبال
کا سو سالہ جشنِ ولادت منایا گیا۔ مگر مجھے بتائیے کہ کیا جلال الدّین اکبر اور نور الدین جہانگیر
کی برسی منائی جاتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ دُنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اُن پیغمبرانِ وقت میں کئی نام ادیبوں کے بھی ہوں گے۔ چلو تھوڑی دیر کے لیے پیغمبرانِ وقت کا تذکرہ نہیں کرتے۔ صاحبِ تصانیف بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ داتا گنج بخش کشف المحجوب کے مصنّف، امام غزالی کیمیائے سعادت کے مصنّف، مولانا روم مثنوی کے مصنّف، یہ سب کے سب اگر اپنے اپنے وقت میں منبعِ رشد و ہدایت تھے تو اُن کی تصانیف آنے والی نسلوں کے لیے بھی سرمایۂ رحمت بنیں۔ گویا زندگی کو دائمی زندگی تحریروں نے بخشی، میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ہم خدا سے بھی آشنا نہ ہوتے اگر وہ صاحبِ تصنیف نہ ہوتا۔

ادیب سردار بھی اپنی باتیں کہتے آئے ہیں۔ آج مجھے اپنے ادیب بھائیوں سے گلہ یہ بھی کرنا ہے کہ جب تک بدیسی حکومت تھی یعنی کہ ہم پہ انگریز حکمران تھا اُن دنوں ادیب کا قلم بہت رواں تھا۔ بہت جواں تھا۔ اُن دنوں باری علیگ "کمپنی کی حکومت" لکھتا تھا۔ سعادت حسن منٹو "نیا قانون" لکھتا تھا۔ جوش ملیح آبادی بھی انقلاب و انقلاب کے نعرے لگاتا تھا۔ اس کے برعکس آج ہم آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دیکھ نہیں رہے۔ کان رکھتے ہوئے بھی وقت کی آواز کو نہیں سن رہے۔

میرا مدعا یہ نہیں کہ ہم حکومتِ وقت کے خلاف لکھیں۔ میرا مدعا صرف اور صرف اتنا ہے کہ ہم ہر ہر قدم پر، اپنے وجود کا احساس دلاتے رہیں۔ اپنے سینوں میں چراغِ درد روشن رکھیں اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہیں۔ کیونکہ ہمارے لیے زیست، صرف لذتِ احساس کا نام نہیں بلکہ احساسِ فرائض کا نام ہے۔ یہ صرف اُسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے قلم اور ضمیر سے غداری نہ کریں۔ ہمیں معاشرے کی طرف سے عائد ذمہ داریوں کو ایمان کا درجہ دینا ہوگا۔ اگر ہم مصلحتوں

کا شکار رہے تو ہمارا رقبہ اس ملک کے ساتھ نادان دوستوں والا ہوگا ۔ ہمیں عوام اور حکومت کے درمیان ایک پُل کا کام دینا چاہیے ۔ ہمیں عوام کو بے یقینی کی سرحد سے اُٹھا کر یقین کی سرحد تک پہنچانا ہوگا ۔

جب تک بدیسی حکومت تھی، اُن سے کچھ کہنے سننے کا موقع نہ تھا۔ ہم اُن سے مدد کے لیے کیا کہتے ؟ ہم تو اپنی تحریروں میں "ملک چھوڑ دو" اور "آزادی دو" کے تحریری نعرے لگاتے رہے ۔ آج معاملہ مختلف ہے ۔ آج نہ تو ہم حکومت کے لیے غیر ہیں اور نہ حکومت ہمارے لیے غیر، آج کا ادیب کل کے ادیب سے بھی مختلف ہے پہلے ادیب ہوتے تھے قلی قطب شاہ ایسے بادشاہ اور مصطفیٰ خاں شیفتہ ایسے رئیس، آج کے ادیب اور شاعر شکیب جلالی ایسے تھے اور حبیب جالب ایسے ہیں ۔ تنگ دست و تہی دست، کسی کی اولاد رُل رہی ہے اور کوئی خود ۔ ایسے میں حکومت کے بھی کچھ فرائض ہوتے ہیں ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادیب کو غربت سے دوچار ہونا ہی چاہیے کیونکہ غریبی میں جذبات کی تربیت زیادہ ہوتی ہے ۔ یہ سوچ ہمارے ملک کے لوگوں کی ہے ۔ غیر ممالک میں اہلِ قلم بڑے آسودہ ہیں ۔ جن دنوں میں نے "آپ بیتی" نمبر کا ڈول ڈال رکھا تھا۔ اُن دنوں میں نے دنیا کے بڑے ادیبوں کو خطوط لکھے تھے ۔ چنانچہ میرے مشاہدے میں آیا کہ وہاں تو ہر ادیب کے ہاں کئی کئی سیکرٹری ہیں اور وہ اُن کی طرف سے جواب دیتے ۔ اِدھر ہمارا حال یہ ہے کہ ادبی معاملات میں سیکرٹری رکھنا تو کجا، نکاح میں لائی ہوئی سیکرٹری کو، فون بل کا خرچ بھی نہیں دے سکتے ۔

ہماری حکومت اگر چاہے تو وہ اچھے کام بھی کر سکتی ہے ۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں فرانس نے اپنی آمدنی کا ۱/۳ حصہ ادب و فن کے لیے مخصوص کر دیا تھا ۔ فرانسیسیوں نے جو دُنیا کے ادب و فن میں اِتنا بیش قیمت اضافہ کیا ۔ اس میں حکومت کا بڑا ہاتھ ہے ۔

یہاں پہ کچھ گزارشات صدرِ مملکت سے تھیں۔ کچھ وزیرِ تعلیم سے، مگر میں
نے انھیں یہاں سے اس لیے حذف کر دیا کہ ان کا تعلق عام قاری
سے نہ تھا۔

اگر حکومت نے ہماری ان گزارشات پر توجہ دی جو کہ اس تقریب کے صدر ہی کا کام ہے تو پھر یقین کر لیجیے اس ملک کی تقدیر سنور جائے گی۔ ملک کی تقدیر ان معنوں میں سنور جائے گی کہ کسی ملک کی بڑائی کا انحصار، اس ملک کے لٹریچر ہی سے متعین کیا جاتا ہے۔ اس طرح ادیب بھی جو بے حال ہیں، وہ بھی مطمئن ہو کر ملک و ملّت کی تشکیل میں زیادہ انہماک سے کام کر سکیں گے۔

غرض ہم نے اپنے معاملات، جن پر کہ ادیبوں کی فلاح کا انحصار ہے۔ حکومت کے سامنے پیش کر رکھے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہمارے معاملات، ہماری زندگیوں ہی میں پورے ہو جائیں! ورنہ ہماری اولاد حکومت کا شکریہ مناسب انداز میں ادا نہ کر سکے گی۔

آخر میں، مَیں ایک دو اور باتیں کر کے سلسلہ کلام کو ختم کرتا ہوں۔ میرے ایک مارواڑی دوست نے بتایا کہ مارواڑی زبان میں ایک مقولہ ہے کہ "مرنے والے کو بیٹھ کر روتے ہیں اور بیکار کو کھڑے ہو کر"۔ جب میں نے اس مقولہ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ادیب دونوں ہی طرح سے روتے ہیں۔ بیٹھ کر اپنے لیے اور کھڑے ہو کر دوسروں کے لیے، کیونکہ ہماری زندگی صرف اپنی ذات کے گرد نہیں گھومتی بلکہ ہمارا ایقان دوسروں کی غمگساری پر ہے۔ ہم اپنے کندھوں پر غم و اندوہ کے پہاڑوں کو اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اس کے باوجود دوسرے کے کندھوں پر رائی برابر بوجھ کو بھی برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ وہ اس لیے کہ ادیبوں اور دانشوروں میں شعور اور خواہشوں

کا تصادم، اوسط درجے کے کسی عام آدمی کے مقابل زیادہ شدید ہوتا ہے۔ خواہش یا ناآسودگی شعور پر قابو پالے تو جی نی ایس دیوانگی کی حالت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صفِ اوّل کے کئی ادیب اور دانشور اپنی ناآسودگیوں کے ہاتھوں ضائع ہو گئے۔ حالانکہ ادیب قوموں کی اصل پُونجی ہیں۔ اس پُونجی کی حفاظت اور نگہداشت قوم کا مقدس فرض ہے۔

یہ بات کہنا تو نہیں چاہتا تھا مگر کہہ دوں کہ قوم پر جب بھی آڑا وقت آیا، ادیبوں اور شاعروں نے اپنا کردار بھر پور انداز میں ادا کیا۔ مثلاً ۱۹۶۵ئہ کی جنگ میں ادیبوں اور شاعروں نے خوب لکھا۔ نظم و نثر کی صورت میں آٹھ جلدیں، رائٹرز گلڈ کے زیرِ اہتمام "دفاعی ادبی کمیٹی" نے چھاپیں۔ ایسی تحریروں سے نہ صرف قوم کا حوصلہ بڑھایا بلکہ اس پُرآشوب دَور کو اپنی تحریروں میں محفوظ کر کے آنے والی نسلوں کے بھی حوالے کر دیا۔

رائٹرز گلڈ بین الاقوامی سطح پر بھی، بڑے اہم رول ادا کرتی رہی ہے۔ دُور نہیں جاتے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے چینی ادیبوں کا ایک وفد پاکستان آیا تھا۔ اس کی میزبانی کا شرف پاکستان رائٹرز گلڈ کو بھی حاصل ہوا۔ ہم نے اپنائیت کی وہ فضا پیدا کی کہ انھوں نے خود خواہش ظاہر کی کہ ہمیں بھی رائٹرز گلڈ کا ممبر بنایا جائے۔ چنانچہ وہ گلڈ کے ممبر بنے۔

اس کے جواب میں ہم نے اُن سے یہ کہا: "آپ کی محبّت کا شکریہ! بس ہماری اتنی سی خواہش ہے کہ رائٹرز گلڈ کا یہ انسگنیا (INSIGNIA) جس پر قلم کا نشان ہے اُسے اپنے سینوں پہ آویزاں کر لیں" تو اُن سب کا جواب یہ تھا کہ ادیبوں کی طرف سے قلم کا یہ نشان، ہمارے سینوں پر اُس وقت بھی آویزاں ہو گا کہ جب ہم واپس سرزمینِ چین پر قدم رکھیں گے۔

میں نے ادیبوں کو بھی، حکومت کو بھی، نیکیاں کمانے کے لیے اُکسایا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عبادت میں پورا کون اُترتا ہے۔ ایک فریق یا دونوں یا کوئی بھی نہیں !

یاد رکھیے کہ ہمارے درمیان ایک تیسرا فریق بھی ہے اور وہ فریق زیادہ مہلت نہیں دیتا۔

(مورخہ ۳۰ رجون ۱۹۷۹ء)

چودھری صاحب

یہ مضمون ۱۹۷۲ء میں لکھا گیا تھا۔ اس عرصے میں حالات بھی بدلے،
واقعات بھی بدلے مگر مضمون جوں کا توں ہی رہنے دیا۔

مضمون لکھنے کا ایک انداز تو یہ ہے کہ وہ اتنا سچّا ہو کہ پڑھنے والا اُسے جھُوٹ ہی جھُوٹ جانے۔ ایک انداز وہ ہے کہ وہ اتنا جھُوٹا ہو کہ پڑھنے والا اُسے سچ ہی سچ سمجھے۔ میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ میں نہ ایسا سچ بول سکتا ہوں اور نہ ایسا جھُوٹ۔

کہتے ہیں کہ دو دوستوں کے لیے سوئی کا ناکا وسیع ہوتا ہے لیکن دو دشمنوں کے لیے دُنیا بھی تنگ ہوتی ہے۔ میں مرحوم سے نہ دوستی کا دعویدار ہوں کہ مجھے سوئی کا ناکا بھی وسیع لگے اور نہ میں اُن کا دشمن ہوں کہ مجھے دُنیا بھی تنگ نظر آئے۔ میں تو صرف اُن کا نیاز مند ہوں۔ نہ دوست نہ دشمن بلکہ ایک مدّاح۔

کسی بھی شخصیّت کے سلسلے میں مضمون لکھنا ہو تو اُس کے لیے وقت چاہیے اور اگر زیرِ بحث شخصیّت چودھری نذیر احمد کی ہو تو اُس کے لیے بہت سا وقت چاہیے کیونکہ وہ اپنے دَور کے ایک ایسے ناخدا تھے جن کے ایک ہاتھ میں کتابوں کی حسن کاری کا پتوار تھا اور دوسرے ہاتھ میں ادب کی آبیاری کا۔ پھر جیسا حق اُنھوں نے اپنے منصوبوں کا ادا کیا، وہ منفرد ہی نہیں یگانہ بھی ہے۔ نہ کوئی ایسا پیدا

ہوا اور نہ ہی شاید کوئی ایسا کربِ تخلیق کا مالک پیدا ہوگا، کیونکہ جیسی لگن ان کے سینے میں تھی ویسی لگن اور تڑپ پھر شاید ہی کسی میں پیدا ہو۔ انسان کی قدر و قیمت اُس چیز سے نہیں جو اُسے حاصل ہو جائے بلکہ اُس مقصد سے ہوتی ہے جس کے حصول کے لیے وہ تڑپتا رہا ہو۔ چودھری صاحب اُردو ادب کو جتنا کچھ دے گئے وہ بھی اپنی جگہ دل سے لہو کی بوند ٹپکانے کے مترادف ہے۔

چودھری صاحب کا ذکر ہو تو میں یہ تو نہ کہوں گا کہ چھوٹا مُنہ اور بڑی بات، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ چھوٹا منہ اور بڑا فن کار۔ اگر میں بہ تفصیل ان کی کارگزاریوں کا ذکر کرنے بیٹھ جاؤں گا تو یہ محفل اس کی متحمل نہ ہوگی کیونکہ اُن کے کارنامے ایسے نہیں جنھیں چند منٹوں میں نپٹایا جا سکے۔

ویسے بھی ہم سب جبلتہً چھوٹے چھوٹے حوصلوں کے مالک واقع ہوئے ہیں، اس لیے وہ اپنی کارگزاریوں کا صلہ کسی اور ہی بارگاہ سے پائیں گے۔ میرے نزدیک عبادت صرف وہی نہیں جس سے ماتھے پر گٹّے پڑتے ہوں، بلکہ ہر صالح سوچ بھی بہ زمرۂ عبادات سمجھتا ہوں۔ اُنھوں نے ادب کے ذریعے انسانیت کی اتنی خدمت کی ہے کہ وہ میرے نزدیک بہت سے زاہدوں اور عابدوں کی شب بیداریوں پر بھاری ہے۔

میں اس وقت صرف ناخن کا قرض اُتارنے کی نیّت سے حاضر ہوا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ چودھری صاحب کے ذکر پر، اُن کی گوناگوں شخصیّت کے اظہار میں، میری حیثیت یادوں کے گلستان میں بھٹکنے کے سوا کچھ نہ ہوگی، مگر میرے لیے یہ اعزاز بھی کم اہمیّت نہیں رکھتا کہ یارانِ حزیں کی اس محفل میں، میں بھی اپنے آپ کو شامل سمجھوں۔

اقرار کہ میں چھوٹے دل کا مالک ہوں۔ میں جب بھی اُن کی تعریف کروں گا تو مجھے بھی بڑی تکلیف ہو گی۔ یوں دل دہلے گا جیسے وہ مر کر بھی میرے سر سے فضیلت کی کلغی اُتار لیں گے ــــــ اور کلغی اُترنے کا احساس ہمیشہ اُنھیں ہوتا ہے جن کے سر پر کلغی ہوتی ہی نہیں۔

یاروں کی اس محفل میں چودھری صاحب کی شخصیت پر مجھ سے بہتر مضمون آرائی کرنے والے دوست موجود ہیں، اس لیے میں اپنے لیے راہِ فرار کا ایک ہی راستہ سمجھتا ہوں کہ میں آپ سے اُن کی اور اپنی اُن پینترے بازیوں کا ذکر کروں جو مسابقت کی پاداش میں ہمارے حصے میں آئیں۔

جس وقت "سویرا" کا طوطی بول رہا تھا اُس وقت ہم نے "نقوش" اس لیے نکالا کہ ان کی طوطی کی آواز کو کم کیا جائے۔ یہ کیسا گھٹیا جذبہ تھا، مگر تھا۔ یعنی ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ادبی اعتبار سے "سویرا" کا پڑا کر دیا جائے۔ اس بات کا ذہن میں آنا بشریت کے تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ مگر ہم اس بات کو بھول گئے کہ سوچنا تو انسان کے اختیار میں ہوتا ہے مگر اس کا نتیجہ انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انسان مقدر کو خود بناتا ہے، لیکن اس کی ایک شرط ہے کہ مدِ مقابل چودھری نذیر احمد نہ ہوں۔

میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ اس معرکے میں کون جیتا کون ہارا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ اس پہاڑ سے ٹکر لینا اچھا خاصا مہنگا پڑا۔ اس لیے کہ وہ مجھ ایسے کئی شخصوں کو گھول کے پی چکے تھے۔ وہ تو گھر پھونک تماشا دیکھنا جانتے تھے۔ اِدھر کوئی گھر تو تھا نہیں، صرف تماشا ہی تماشا تھا۔

آخر ہم چودھری صاحب سے بازی کیوں لے جانا چاہتے تھے؟ وہ اس لیے کہ یہ ادب کی دُنیا کے خدا تھے۔ جس ادیب کو چاہا آسمان پر بٹھا دیا، جسے چاہا خاک میں ملا دیا۔ چنانچہ میں تو خاک میں نہ ملنے کے جتن کر رہا تھا۔ دوسرے میں یہ جانتا تھا کہ اپنے گھر کا دھواں دوسرے کی آگ سے بہتر ہے۔

میری گزارشات سے اگر آپ نے یہ تأثر لیا ہو کہ میں انھیں جابر قسم کا ناشر و مدیر ثابت کرنے نکلا ہوں تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ قبل اس کے کہ مزید "قلم کشائی" کروں، میں یہ عرض کر دوں کہ وہ اتنی صلاحیتوں کے مالک تھے کہ اُن کی قدآور شخصیت کے سامنے سب بونے تھے۔ اور کوئی ایسا سمجھے یا نہ سمجھے، میں تو یہی کہوں گا کہ اُن کی موجودگی میں، میں اپنے آپ کو بونا ہی سمجھتا رہا۔ اُنھوں نے جتنی راہیں بنائیں وہ خود کاٹیں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے زندگی کے ایک موڑ پر یہ سوچنا پڑا کہ اُس روش پر چل کر، جس پر کہ چودھری صاحب چل رہے ہیں، اپنا وجود برقرار رکھنا میرے لیے جوانی کا گھُن بن جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنی راہیں مختلف بنانی شروع کر دیں۔ وہ اگر پشاور کی سمت اُڑے جا رہے تھے تو میں نے اپنی ادبی گاڑی کا رُخ کراچی کی سمت موڑ دیا۔ میں تو "مسافروں" کی سہولت کے لیے کچھ رواداری بھی برت لیتا تھا مگر وہ بڑے کٹّر تھے۔ فوراً مسافر کو لاہور کے اسٹیشن پر اُتار دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب ترقی پسند ادیبوں نے یہ طے کر لیا کہ اپنے رسائل میں غیر ترقی پسند ادیبوں کو نہیں چھاپیں گے تو اس مہم میں "سویرا" پیش پیش تھا۔ مجھے اُس روش سے اتفاق نہ تھا۔ میری سوچ یہ تھی کہ ادب کو خانوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ ایک ہی پلیٹ فارم سے سبھی کو اپنی تخلیقی کاوشوں کو پیش کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ چنانچہ بہت توں تراں ہوئی،

مگر میں اپنی سوچوں میں کچا نہ تھا۔ اُدھر چودھری صاحب بھی ہٹ کے پکّے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک ہی نہج کا قافلہ دو مختلف سمتوں میں منزل کی تلاش کو نکل کھڑا ہوا۔

چودھری صاحب اتنے جی دار پبلشر تھے کہ انھوں نے فنی تقاضوں کے پیشِ نظر حکومت کے احتساب کی بھی کبھی پروا نہ کی۔ وہ خطر پسند طبیعت کے مالک نہ سہی مگر اُن کی متاعِ جرأت اتنی ضرور تھی کہ کم سوادوں کے پتّے پانی ہو جاتے تھے۔ وہ ہر قسم کی این د آں سے بے نیاز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن پر کئی بار مقدّمے چلے جسے اُنھوں نے ہمیشہ خندہ پیشانی سے جھیلا۔ اگر اُردو ادب کو چودھری صاحب جیسا جیوٹ نہ ملتا تو آج اُردو ادب گل و بلبل کے افسانوں کے ہی راگ الاپ رہا ہوتا، کیونکہ جب بھی کوئی فن کار حوصلہ کر کے کوئی دھڑلّے کی چیز لکھتا تو وہ سیدھا چودھری صاحب ہی کے پاس پہنچتا جیسے مرید مُرشد کے پاس۔

جب سعادت حسن منٹو نے "ٹھنڈا گوشت" لکھا تو وہ بھی چودھری صاحب ہی کے پاس پہنچا۔ اُنھوں نے پہلے رسالے میں، پھر کتابی صورت میں چھاپنے کی ہامی بھر لی۔ جب افسانہ چھپنے میں دیر ہو گئی تو منٹو صاحب نے ایک چِٹ چودھری صاحب کے نام لکھی کہ "رسالہ 'جاوید' والے اپنا رسالہ ضبط کرانا چاہتے ہیں، اس لیے براہِ کرم انھیں "ٹھنڈا گوشت" کا مسودہ دے دیجیے۔"

منٹو کا افسانہ "بُو" چھپا تو وہ بھی چودھری صاحب ہی کے رسالے "ادبِ لطیف" میں۔ عصمت چغتائی کا افسانہ "لحاف" چھپا تو وہ بھی انھی کے رسالے میں۔ "کمینی کی حکومت" (باری علیگ) چھپی تو وہ بھی انھی کے ادارے سے۔ غرض تخلیقی کاموں کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں وہ سُولی پر چڑھنے کے لیے تیار رہے۔ پوری ادبی تاریخ میں اپنے مقصد

سے ایسی لگن رکھنے والا اور کوئی نہیں ـــــ اور کوئی نہیں ۔

چودھری صاحب ڈیل ڈول کے اعتبار سے رستم ہند ہی کے خاندان سے معلوم ہوتے تھے ۔ کسرتی بدن، اُونچا قد، چوڑا چکلا سینہ ۔ جو بھی دیکھتا تھا، دیکھتا رہ جاتا تھا ۔ پیٹھ پیچھے انھیں کوئی بُرا بھلا کہتا ہو تو کہتا ہو، منہ پر کچھ کہنے کی مجال کسی میں نہ تھی ۔ منٹو کہا کرتے تھے : " میں بڑا منہ پھٹ ہوں مگر جب غصّے میں آتا ہوں تو میرا غصہ چودھری صاحب کے چوڑے چکلے سینے ۔ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے " ۔

چودھری صاحب کھانے کے بڑے شوقین تھے ۔ خود بھی کھاتے تھے یاروں کو بھی کھلاتے تھے ۔ کرشن چندر بھی کھانے کے شوقین نکلے ۔ میں نے کرشن چندر سے ایک دن پوچھا تھا " آپ ہندو ہو کر اتنے لذیذ اور اتنے متنوّع کھانے کھاتے ہیں کہ مجھے آپ کے ہندو ہونے پر شبہ ہونے لگا ہے " ۔

کہنے لگے " یہ چسکا چودھری صاحب نے ڈالا ہے ۔ ڈھیروں کھاتے تھے اور روز کھاتے تھے ۔ باقی رہا مذہب کا معاملہ تو اس کے لیے عرض ہے کہ میرا نام ہندوؤں والا ہے مگر میں ہندو نہیں ہوں ۔ اگر میرا نام مسلمانوں والا ہوتا تو میں مسلمان بھی نہ ہوتا کیونکہ میرا مذہب تو صرف انسانیت ہے " ۔

غرض کرشن چندر کا چودھری صاحب سے ربط ضبط حد درجہ اپنائیت والا تھا ۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبّت کرتے تھے جس کا حال کرشن چندر کے ایک خط سے کھلتا ہے ۔ اسی خط سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ خود چودھری صاحب دوستی کے کتنے گہرے پانیوں میں تھے :

"پیارے نذیر بھائی!

ایک عرصے کے بعد، اور قیامت سے بھی طویل عرصے کے بعد، تمھارا خط ملا، دل بھر آیا۔ کہاں ہم روز جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے تھے، چین نہ پلتے تھے اور کہاں یہ زمانہ کہ خط کو بھی ترس گئے۔ ارے میرے بھائی! بال بچّے داری تو ہر ایک کے ساتھ ہے اور اس عمر میں، جس میں ہم دونوں ہیں، ہر ایک کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اور کون ہے جو زندگی کے اس خلجان سے محفوظ ہے؟ تمھاری عزیز بیٹی کے ساتھ اس کے سسرال والوں نے جو نامنصفانہ سلوک کیا، اس سے میرا دل بہت بے چین ہوا۔

میری مجھلی بیٹی بھی عرصہ چھ سال سے پاگل ہے اور عرصہ چھ سال سے ہزاروں روپے اس کے علاج پر صرف کر چکا ہوں۔ کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ اس کی بھولی اور پیاری صورت دیکھ کر یہ جی بھی نہیں چاہتا کہ اُسے کسی پاگل خانے میں داخل کرا دوں۔ گھر پر رکھ کر ہی اس کا علاج کرا رہا ہوں۔ تم سمجھ سکتے ہو کس قدر مہنگا ہوتا ہوگا اور کس قدر تگ و دو مجھے اس سلسلے میں شب و روز کرنی پڑتی ہے۔ مگر یہ تو زندگی ہے میرے بھائی! اپنے رنج کو اگر ہنس کر نہ ٹالو گے تو یہ رنج ہمیں کھا جائے گا اور ہم زندگی کی دوسری ذمہ داریاں کیسے پوری کر سکیں گے۔ اس لیے میرے بھائی! ذرا ہمّت سے کام لو اور دنیاداری کے روگ کو جی پر نہ لگاؤ، اس میں تمھارا ہی نقصان

ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے چاہنے والوں کو خط لکھنا نہ بھولو
۔ رنج بانٹا بھی جا سکتا ہے۔ ایسے بھی تو بے مروّت ہم نہیں ہیں۔"

اس خط میں جو اپنائیت ہے، جو خلوص ہے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر میں یہ خط اور دیگر خطوط نہ دیکھتا تو میں خود بھی بہت سی غلط فہمیوں کا شکار رہتا کیونکہ میں نے دیکھا کہ کرشن نے بعض معاملات میں مجھ پر چودھری صاحب کو اہمیّت دے رکھی ہے۔ اس کے اظہار میں میری کوئی سُبکی نہیں، البتہ چودھری صاحب کی اہمیّت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ بس مجھے یہاں اسی نکتے کی وضاحت کرنا ہے کہ ہم بیٹے وہ جیتے۔

چودھری صاحب نے اچھی اور خوبصورت کتابیں چھاپنے کی نہ صرف ابتدا کی بلکہ اُسے انتہا تک پہنچایا۔ وہ اس میں اس حد تک غرق رہے کہ پھر ان کے لیے دُنیا کی ہر فضیلت ہیچ تھی۔ اپنی لگن سے عشق، وہ بھی اس حد تک عشق کہ اس میدان میں اور کسی کے حصّے میں نہ آیا۔

پھر یہ فن ان کے خاندان میں چلا جو سراسر عطیہ چودھری نذیر احمد کا ہے۔ چودھری رشید احمد نے مکتبۂ جدید کی طرف سے بڑی خوبصورت کتابیں چھاپیں۔ چودھری بشیر احمد نے بھی سستی کتابیں چھاپنے کا منصوبہ بنایا۔ حنیف رامے نے بھی، جب تک وزیر نہیں بنے تھے، اس فن کو آگے بڑھایا۔ بلکہ یہ خود بھی بڑے پائے کے مصوّر تھے۔ انھوں نے بھی اپنے فنِ مصوّری کی آمیزش سے اس فن میں مزید رنگ بھرے۔ اگر وہ سیاست کی وادی میں نہ نکل جاتے تو بڑی امیّد تھی کہ وہ ادب

کی دُنیا میں اپنے رشحاتِ قلم سے بھی کارہائے نمایاں انجام دیتے اور کتاب سازی کے فن کو چار چاند لگاتے۔ بے شک آج اُن کی موٹر پر جھنڈا لہراتا ہے مگر وہ جھنڈا اُن کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا جو لوگوں کی ذہنی تربیت کے لیے برسوں نہیں صدیوں اُونچا رہتا۔

حنیف رامے نے ایک بار کہا تھا: "مصوّری میرا کسب ہے اور کتاب سازی میرا پیشہ۔ ان دو باتوں کو میرے وجود میں، کتابوں کی تزئین و آرائش کی صورت میں، مقامِ اتصال مل گیا ہے۔ یوں تو میں خود بھی کتابیں شائع کرتا ہوں، لیکن اس میدان میں اپنے بڑے بھائی (چودھری نذیر احمد) کو گرو مانتا ہوں۔ یہ انھی کی ہمت افزائی تھی کہ اُنھوں نے اُس زمانے میں میرے نقوش کو اپنی مطبوعات اور رسالہ "سویرا" کی پیشانی پر سہرے کے طور پر جگہ دی"۔

پہلے میرا ارادہ تھا کہ چودھری صاحب کے بارے میں محدود سے انداز میں گفتگو کر کے آپ سے رخصت ہو جاؤں گا، مگر اب سوچ رہا ہوں کہ آخر ایسی بھی کیا جلدی! شخصیت کی بھرپور عکاسی کے سلسلے میں اگر میں حق ادا نہیں کر سکتا تو کم از کم حق ادا کرنے کی نیّت تو باندھوں۔

چودھری صاحب کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی کا بندہ بڑا قائل ہے۔ بیانے اتنے کہ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیں۔ قتیل شفائی کہتے ہیں کہ میں "ادبِ لطیف" میں بہ حیثیت معاون مدیر کام کرتا رہا ہوں۔ مجھے خود چودھری صاحب نے ہری پور ہزارہ سے بلوایا تھا۔ میں کام کرتا رہا۔ جب مجھے چودھری نے تنخواہ دی تو وہ ۷۴ روپے تھی۔ میں نے چودھری صاحب سے پوچھا "جناب! ۷۵ کیوں نہ کر دی؟" کہنے لگے،

"بس اتنے ہی قبول کرو!"

میں اس "معمے" کو حل نہ کر سکا۔ میں نے اپنے رفیقِ کار فکر تونسوی سے اس کا ذکر کیا۔ وہ ہنسنے لگے اور ہنستے ہی چلے گئے۔

انھوں نے اُن سے پوچھا "پہلے کچھ بتلائیے، پھر ہنسیے"۔

فکر نے کہا "نذیر چال ہے یہ!"

قتیل نے کہا "نذیر چال کیا؟"

فکر نے کہا "اگر چودھری صاحب آپ کو ۱۷۵ روپے دیتے تو انھیں مجھے ۱۷۶ دینے پڑتے۔ چونکہ میں آپ سے سینئر ہوں اس لیے اُنھوں نے آپ کو ۱۷۴ روپے دیے تاکہ سینیارٹی مجروح نہ ہو"۔

کرشن چندر طالب علمی کے زمانے ہی میں خاصے مشہور ہو گئے تھے۔ راجندر سنگھ بیدی کا بھی ڈنکا بج رہا تھا، لیکن وہ ڈاک خانے میں کلرک تھے۔ جب اوپندر ناتھ اشک ادب میں چھا رہے تھے تو وہ اپنے بھائی کی دندان سازی کی دکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ جب کنہیا لال کپور قابلِ توجہ بن رہے تھے تو وہ الیتہ ڈی۔اے۔ وی کالج میں لیکچرار تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان سب میں بیٹھ کر کہا کرتے تھے "میری بات مانو اس لیے کہ میں پروفیسر ہوں اور تم سب معمولی بابو!"

ان سارے ادیبوں کے فن کے نکھار میں چودھری صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔ کرشن چندر نے بتایا کہ چودھری صاحب اس ڈھب سے بات کرتے تھے کہ ہم سب اچھا لکھنے کے سلسلے میں تاؤ میں آجایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم میں سے جب کوئی ایک کچھ لکھ لیتا تھا تو وہ اس ٹوہ میں رہتا تھا کہ چودھری صاحب ہمیں کہیں اکٹھا بٹھا کر

ہم سے وہ افسانہ سنیں چنانچہ چودھری صاحب چوکڑی کو لے کر کسی ہوٹل میں جا بیٹھتے تھے۔ کہتے "ہاں بھئی اب سناؤ افسانہ"۔ لکھنے والا سنا رہا ہے، باقی سب چلتے پی رہے ہیں اور اس گھات میں بھی کہ کوئی خامی پکڑیں اور اس کے منہ پر دے ماریں۔ اس خوف نے سب کو چوکنا کر رکھا تھا۔ یوں مسابقت میں ذہنوں کی دھاریں تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ کرشن چندر نے بھی اقرار اس کا کیا کہ میں اپنے فن کی جلا اور اس کی تشہیر کے سلسلے میں چودھری صاحب کا ممنون ہوں۔

کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور کنہیا لال کپور، چودھری صاحب سے اتنے بے تکلف تھے کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ زیادتی بھی کر گزرتے تھے۔ مثلاً مجھے کرشن چندر نے بتایا تھا کہ میں ریوڑیاں کھانے کے لیے پیسے چودھری صاحب کی جیب سے خود ہی نکال لیا کرتا تھا اور میرا ہاتھ نہ روکتے تھے۔ بس اتنا ہی کہتے تھے کہ ریاض کی امی نے بھی ایک چیز کی فرمائش کر رکھی ہے۔ بس اتنے پیسے رہنے دینا کہ اُس چیز کو بھی خرید سکوں۔

میں جواب میں کہتا "چودھری صاحب! آپ کی جیب میں تو کُل ایک روپیہ دو آنے ہیں"۔ اس پر چودھری صاحب کہتے "تو دو آنے لے لے، باقی ایک روپیہ رہنے دے تاکہ تیری بھابی بھی ناراض نہ ہو"۔ اس واقعے پر کرشن چندر کا تبصرہ یہ بھی تھا: "جیسے وہ ماحول بھائیوں بھائیوں والا تھا، جیسے ایک بھائی دوسرے بھائی سے کچھ مانگ رہا ہو، جیسے ایک بھائی دوسرے بھائی کو کچھ دے رہا ہو۔

منٹو کی جتنی ناز برداری چودھری صاحبان نے اُٹھائی، کم کسی نے اُٹھائی ہوگی

میں تو منٹو سے پناہ مانگتا تھا، اس لیے کہ میں اُن کی تند و تیز طبیعت کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا، مگر چودھری نذیر احمد اُسے سینے سے لگائے پھرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ منٹو صاحب چودھری صاحب کو بُرا بھلا بھی کہتے تھے مگر وہ چودھری صاحب سے اپنا دامن بھی نہیں چھُڑا سکتے تھے۔ اگر کبھی منٹو صاحب نے کہانی لکھنے میں دیر کر دی تو چودھری صاحب منٹو کو گھر سے پکڑ لائے۔ اپنے دفتر لے آئے۔ کہا "یار کہانی لکھ دو"۔ کیا مجال کہ منٹو بھی اُن کا کہا ٹال دیں۔ یوں چودھری صاحب نے اُن سے درجنوں ہی کہانیاں لکھوائی ہوں گی جن میں اُن کا مشہور افسانہ "موذیل" اور ڈراما "اُس منجدھار میں" بھی شامل ہیں۔

"موذیل" افسانہ لکھا تو دفتر "سویرا" میں بیٹھ کر گیا تھا مگر وہ چھپا "نقوش" میں۔ اس کی روئیداد دلچسپ ہے۔ اتفاق کہ منٹو نے مجھے اُوپر تلے دو افسانے دیئے جو مجھے پسند نہ آئے، جس کا اظہار میں نے نہایت ادب کے ساتھ منٹو صاحب سے کر دیا تھا۔ چنانچہ منٹو صاحب اپنے فن کارانہ وقار کی خاطر افسانہ "موذیل" بغیر اطلاع کے چودھری کے ہاں سے اٹھا لائے تاکہ مجھے بتا سکیں کہ دیکھو، میں اب بھی ایسا لکھ سکتا ہوں

جب منٹو نے مجھے "موذیل" نامی افسانہ دیا تو ساتھ ہی اپنی باریک آواز میں بڑے زور سے کہا "پڑھو اور اپنی رائے دو"۔ وہ افسانہ بہت اچھا تھا مگر میں نے سوچا اگر اس وقت افسانے کی زیادہ تعریف کر دی تو پھر مجھے ملاحیاں بھی زیادہ سننی پڑیں گی۔ اس لیے ازرہِ احتیاط اُن کے سوال "کیسا ہے؟" کے جواب میں کہا "یہ ہے منٹو کا افسانہ"۔

یہاں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جب چودھری صاحب کو یہ علم ہوا کہ وہ افسانہ تو اُڑ گیا تو وہ منٹو صاحب کو لے کر میرے پاس آئے۔ منٹو صاحب نے چھوٹتے ہی کہا "وہ افسانہ واپس دے دو۔ وہ چودھری صاحب کا ہے۔ میں تو وہ افسانہ صرف اس لیے لایا تھا کہ تیری اکڑ کو اپنے فن سے شکست دوں"۔

میں نے اپنے ہاتھوں سے افسانہ جلتے دیکھا تو کہا "اگر آپ مجھ سے یہ افسانہ لے گئے تو پھر میں اُن دو افسانوں کی موجودگی میں بھی کہوں گا کہ آپ اب نہیں لکھ سکتے۔"

منٹو پھر تن گیا "اچھا یہ بات ہے تو پھر رکھ اپنے پاس افسانہ، میں چودھری صاحب کو اور لکھ دوں گا"۔ یہ سنتے ہی چودھری صاحب کا رنگ فق ہو گیا، جیسے خون نچڑ گیا ہو۔ چودھری صاحب یہ کہتے ہی رہے "میں افسانہ لے کے ٹلوں گا"۔

اُدھر منٹو صاحب کہتے رہے "میری جان! یہاں سے اُٹھو تو سہی میں تجھے ایسے ایسے دس افسانے لکھ دوں گا"، مگر چودھری صاحب کا اصرار جاری رہا: "نہیں، یہی افسانہ لوں گا"۔ بالآخر منٹو چودھری صاحب کو گھسیٹ کر لے ہی گئے۔

جب یہ نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آتا تو مجھے بہت دُکھ ہوتا۔ رات بھر نیند نہ آئی۔ چودھری صاحب کو افسانہ اتنا عزیز تھا کہ وہ اس پر مٹے ہوئے تھے یہی وجہ تھی کہ دوسرے دن وہ افسانہ لے کر میں خود چودھری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "افسانہ حاضر ہے"۔

کہنے لگے "یہ افسانہ مجھے بڑا عزیز ہے۔ اس افسانے کی خاطر آٹھ دس دن تک ان کے ساتھ گھومتا رہا۔ چھ بوتلیں اپنی گرہ سے پلائیں۔ مگر اب اسے تو ہی

چھاپ لے۔ میں پھر دریا میں جال ڈال کر بیٹھ جاؤں گا۔"

قیامِ پاکستان سے پہلے، جب متحدہ ہندوستان میں سوشلزم کا نام لینا جرم تھا، یہاں لاہور میں بیٹھ کر پہلے پہل چودھری نذیر احمد نے ہی اس موضوع پر کتابیں چھاپیں۔ مثلاً لینن، کارل مارکس اور سوشلزم نامی کتابیں۔ آج جب پاکستان میں پیپلز پارٹی اسی نظریے کے تحت وجود میں آئی ہے تو چودھری صاحب کا وہ کام، اس نظریۂ حیات کے نام لیواؤں کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ چودھری صاحب نے ہر وہ کام کیا جس میں خطرات زیادہ تھے۔ ترقی پسند تحریک اس وقت حکومتِ برطانیہ کے لیے پسندیدہ نہ تھی مگر چودھری صاحب نے زیادہ تر کام اسی تحریک کے متعلق کیا۔ متعدد کتابیں چھاپیں اور متعدد مقدمے چلے مگر چودھری صاحب کے پائے استقلال میں سرِمو فرق نہ آیا، بلکہ ان کے حوصلے جوان سے جوان تر ہوتے چلے گئے۔

چودھری صاحب کو ہر نئی چیز سے محبّت تھی، خواہ وہ نیا ادب ہو، خواہ وہ کوئی نیا سیاسی نظریہ ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر نئی تحریک میں اُن کا شمار صفِ اوّل کے جاں نثاروں میں ہو۔ بلاشبہ وہ اپنے دماغ کی جھنکار میں شبنم کی آنچ کو بھی محسوس کر لیا کرتے تھے۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ خود بھی ایسے نظریات کے حامل تھے؟ یا یہ کہ وہ محض خود نمائی کے لیے ایسا کرتے تھے؟ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے، میں تو یہی کہوں گا کہ وہ ذہنی طور پر بھی نئی تحریکوں سے وابستہ تھے مگر چودھری صاحب کا ایک انٹرویو میرے لیے باعثِ حیرت ہے جس میں ان سے

سوال کیا گیا تھا کہ :

"خاص سیاسی شعور سے آپ کی مُراد کمیونزم اور ترقی پسند تحریک سے ہے؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُس دور کے لکھنے والوں کی اکثر کہانیوں کا یہی موضوع تھا۔ چودھری صاحب کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ بھی کمیونزم کی طرف راغب تھے؟"

چودھری صاحب کا جواب یہ تھا: "خدا کا شکر ہے کہ میں ہمیشہ مسلمان رہا ہوں میں سرے سے سیاسی آدمی ہی نہیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے ہمیشہ سے اشاعتِ کتب میں نئے نئے تجربات پیش کرنے کا شوق رہا ہے۔ اسی دیوانگی نے مجھے نئی نئی چونکا دینے والی تحریروں کے حیران کُن انداز سے چھاپنے پر مجبور کیا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ یہ تحریریں زیادہ تر ترقی پسند ادیبوں کی ہوتی تھیں۔"

(ماہنامہ "کتاب" ستمبر ۱۹۶۶ء)

یہ انٹرویو چودھری صاحب کی زندگی میں چھپا تھا۔ اگر انٹرویو لینے والے نے کچھ باتیں اپنی طرف سے لکھ دی تھیں تو چودھری صاحب اس کی تردید کر سکتے تھے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ چودھری صاحب کے اس انٹرویو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ابھی تھوڑے دن ہوئے چودھری نذیر احمد کے بھائی حنیف رامے صاحب نے فرمایا کہ "میرے بھائی نے جب کہ برِصغیر میں فرنگیوں کا استحصالی نظام عروج پر تھا تو اُس وقت تقریباً دو سو کتابیں سوشلزم، کمیونزم اور انقلابی ادب پر شائع کیں"۔ انھوں نے یہ بھی کہا "پاکستان میں موجودہ عوامی حکومت جس دَور کی سمت رواں دواں ہے، اس کی بنیاد رکھنے میں میرے بھائی نے اَن تھک محنت

اور بھرپور جدوجہد کی"۔ ("مساوات" ۲۴ مئی ۱۹۷۲ء)

بندہ تو سرِ تسلیم خم ہے کی خُو رکھتا ہے مگر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ چودھری صاحب خود نظریاتی طور پر کیا تھے اور کیا نہیں تھے؟ یہاں میں ان کے انٹرویو کا ہی اقتباس پیش کروں گا تاکہ بات واضح ہو جائے۔ مثلاً:

"اچھے ناشر کا کام اچھے مصنّف دریافت کرنا اور اُنھیں نئے انداز میں پیش کرنا بھی ہے۔ اب اس میں میرا کیا قصور کہ اس دور کے بہترین لکھنے والے ذہنی طور پر اشتراکیت کے حلقہ بگوش تھے ورمیں غریب صرف کتاب سازی کے عشق میں مارا گیا۔ بڑے بڑے عذاب نازل ہوئے، گھر اور دکان پر بار ہا چھاپے پڑے، مقدمات چلے، بدنامیاں ہوئیں"۔ (ماہنامہ "کتاب" ستمبر ۱۹۶۶ء)

اِدھر ظہیر کاشمیری بھی جن کا خاصا وقت چودھری صاحب کی رفاقت میں گزرتا تھا کہتے ہیں:

"چودھری صاحب نے جب نیا ادارہ کی بنیاد رکھی اور مجلّہ "سویرا" کا اجرا کیا تو ان کے سامنے ایک بلند نصب العین تھا۔ اُس دَور میں حکومتی طبقے جاگیردارانہ کردار ادا کرنے کے حامی تھے اور ان کے سیاسی دستور میں آزادیٔ تحریر و تقریر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس دور میں چودھری صاحب نے اپنے لیے جان بوجھ کر ایک کٹھن راستہ قبول کیا۔ اُنھوں نے انقلابی ادب و شعور کو پھیلانے کا بیڑا اُٹھایا اور تادمِ مرگ اس فریضے کو نبھاتے رہے"۔ ("مساوات" ۲۶ مئی ۱۹۷۲ء)

جب کسی غلط بات پر اصرار کیا جاتا ہے تو طبیعتیں مکدّر ہوتی ہیں، مُوشگافیاں پھیلتی ہیں۔ یوں بلا وجہ قاری کو کھوج کے میدان میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ سیدھی

سی بات یہ ہے کہ چودھری صاحب نے سوشلزم پر بھی کتابیں چھاپیں ۔ یوں یہ قدم اس وقت اجتہادی تھا، خطرات سے خالی بھی نہ تھا۔ چیلنج قبول کرنے والی طبیعت نے چیلنج قبول کیا تھا۔ بس اس سے زیادہ اُڑان مناسب نہیں ۔

میں نے اس مضمون میں کرشن چندر کا خط پیش کیا تاکہ مصنف اور ناشر کے درمیان رشتوں کا سراغ لگایا جا سکے ۔ میں نے چودھری صاحب کے نظریاتی مباحث کو بھی اُٹھایا تاکہ زیرِ بحث شخصیّت کو اس کے ذہنی پس منظر کے طور پر بھی جانا جا سکے ۔ ہر چند کہ میں ان پہلوؤں سے کنّی کترا کے نکل سکتا تھا مگر میں نے ایسا دانستہ کیا، کیونکہ مجھے اپنی مضمون آرائی سے زیادہ شخصیّت کی باطنی عصمت سے بھی غرض ہے ۔

چودھری صاحب کی ہمہ دانی، زبانی کلامی نہ تھی، بلکہ وہ ہر دنیاوی اور کاروباری معاملے میں درک ضرور رکھتے تھے : کتاب کی چھپائی سے لے کر بچّوں کے ختنے تک ہر اُونچ نیچ سے وہ نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کے رموز سے بھی آگاہ تھے ۔

بچّوں کے ختنے کی بات میں نے یوں کی کہ میرے سامنے ایک صاحب نے ان سے کچھ روپے مانگے ۔ وجہ یہ بتائی کہ بچے کا ختنہ کرانا ہے ۔ چودھری صاحب نے فرمایا " روپے تو میں دے دوں گا لیکن تم ابھی بچّے کا ختنہ نہ کرانا "۔

" کیوں ؟ "

" آج کل جو نائی کے بچّے اُسترا لے کے بیٹھے ہیں، بالکل اناڑی ہیں۔ ہاتھ صاف پڑ گیا تو پڑ گیا، ورنہ ـــ "

" ورنہ کے بعد چودھری صاحب نے جو کچھ کہا تھا، وہ میں لکھ نہیں سکتا۔ مگر وہ بات مجھے جب بھی یاد آتی ہے، میرا مارے ہنسی کے بُرا حال ہو جاتا ہے ۔

چودھری صاحب یاروں میں بیٹھ کر بڑی کھلی باتیں کرتے تھے، مگر افسوس کہ میں انھیں ضبطِ تحریر میں نہیں لاسکتا۔ کبھی کرشن چندر سے ملاقات ہو تو اُن سے پوچھ لیجیے گا، کبھی کنہیا لال کپور سے ملاقات ہو تو ان سے پوچھ لیجیے گا، کبھی دیوندر ستیارتھی سے ملاقات ہو تو ان سے پوچھ لیجیے گا۔ ہوسکتا ہے ستیارتھی کچھ نہ بتائیں کیونکہ چودھری صاحب ان کی بڑی مٹی پلید کیا کرتے تھے۔ ہاں اگر یہ پھکڑّ پن میں کسی سے دبتے تھے تو وہ صرف سعادت حسن منٹو تھے۔

اگر آپ میں سے کسی کی چودھری صاحب سے بےتکلّفی تھی تو پھر آپ چودھری صاحب کے ایسے کمالات سے بھی آگاہ ہوں گے کہ داستان گوؤں ہی کی طرح وہ بھی سامعین کو ہلنے نہ دیتے تھے۔ اُن کی خوش گفتاری سے سب خوش تھے، سب نہال ہوتے تھے۔ اُن کی گفتگو بہ طور تضحیک نہیں ہوتی تھی بلکہ بہ طور خوش وقتی۔ پھر یہ بھی نہیں کہ حفظِ مراتب کا خیال نہ ہو۔ لیکن جن سے بےتکلف تھے "رج کے" تھے۔ جن سے بےتکلّف نہ تھے، اُن کے لیے بقراط تھے۔ یعنی جیسی محفل ویسی بولی ٹھولی۔ کبھی لکھنوی تکلّف ہی تکلّف، کبھی پنجابی دریا دِلی ہی دریا دِلی۔

انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ بات کو کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کرنا چاہیے۔ بعض اوقات وہ بات کو بیچ ہی سے شروع کر دیتے تھے اور مخاطب کو معلوم نہ ہو پاتا کہ معاملہ کیا ہے۔ کبھی وہ افسانوی ٹیکنیک استعمال کر کے گفتگو کو آخر سے شروع کر دیتے تھے۔ پھر وہ "زیرِ غور کہانی کا تار و پود بُنتے تھے۔ غرض وہ رام کر لینے والی گفتگو کے آرٹ سے اتنا واقف تھے جتنا کہ میں ناواقف ہوں۔ میں کبھی اپنا مافی الضمیر دوسروں پر واضح نہ کر سکا۔ وہ کبھی اپنی بات دوسروں کے دل میں اُتارنے

بغیر نہ ٹلے۔

چودھری صاحب جب کسی مصنّف سے کوئی مسوّدہ لیتے تھے تو اس میں بہت مین میخ نکالتے تھے "یہ افسانہ نکال دو، وہ افسانہ شامل کر دو۔ یہ غزل لے لو، وہ غزل دے دو۔" یوں جب مسوّدہ باون تولے پاؤ رتی کے مصداق ہو جاتا تو اس کے بعد خوش نویس کا انتخاب کرتے۔ پھر سوچ کا چکر دوسری نہج پر چلتا۔ فلاں خوش نویس اس کتاب کے لیے موزوں ہو گا؟ نہیں وہ تو باریک اچھا نہیں لکھ سکتا، جلی اچھا لکھتا ہے، فلاں موزوں رہے گا؟ نہیں نہیں اس سے بہتر فلاں رہے گا۔ چنانچہ حد درجہ ردوکد کے بعد خوش نویس کا انتخاب ہوتا۔

اب خوش نویس سے کہا جا رہا ہے "نئی نب بنا کے لکھنا، ہر روز نئی سیاہی بنانا، اچھا رنگا ہوا کاغذ لینا (یہ اُن دنوں کی بات ہے جب چھپائی لیتھو کی ہوا کرتی تھی) پھر اس پہ خوب گھوٹا لگانا، جب طبیعت حاضر نہ ہو تو نہ لکھنا۔

جب اتنی احتیاطوں کے بعد کتابت مکمل ہو جاتی تو پروف ریڈنگ کا اہتمام ہوتا۔ پہلے کسی پروف ریڈر سے پروف پڑھوائے جاتے۔ اس سے کہا جاتا "بس یہی سمجھنا کہ میں کسی آسمانی کتاب کی پروف ریڈنگ کر رہا ہوں۔ ایک غلطی بھی نہ رہنے پائے۔"

اس کے بعد خود کاپیوں کو کھول کر بیٹھ جاتے۔ لفظوں کے گرد نشان لگتے جاتے کہ اس لفظ کی نشست درست کی جائے، اُس لفظ کا دائرہ ٹھیک کیا جائے، اس لفظ کی کشش کو بہتر بنایا جائے۔

جب یہ سارے مرحلے طے ہو جاتے تو خوش نویس سے کہا جاتا دیکھو بھئی! اغلاط کی درستی کتاب لکھنے سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ کہیں گھچ پچ نہ کرنا، کہیں

ربڑ کے ساتھ دھبے ڈال کر اُوپر لفظ نہ لکھ دینا، بلکہ چیپی لگا کر درستی کرنا"۔

جب یوں خوش نویس کے ہاتھ سے کاپیاں سنور کر نکلتیں تو پھر یہ پریس میں پہنچتے۔ کہتے "اچھی گریں کی ہوئی صاف ستھری پلیٹوں پر کاپیوں کو لگانا۔ نہ داب اتنی زیادہ دینا کہ الفاظ پھیل جائیں اور نہ اتنی ہلکی رکھنا کہ الفاظ پلیٹ پر نہ اُتر سکیں۔ پھر جب کاپی لگ جائے تو دوسرے دن صبح کے وقت اچھی طرح رول دے کے پروف نکالنا۔ پھر پلیٹوں کو فوراً صاف کر دینا تاکہ لفظوں پر یا لفظوں میں سیاہی جم نہ جائے ورنہ لفظوں کی نوک پلک غارت ہو جائے گی"۔

پلیٹیں تیار ہو جائیں تو مشین مین سے پوچھتے "آج کل کون سی سیاہی استعمال کر رہے ہو؟ رُولے اور بستر ٹھیک ہے کہ نہیں؟ اگر ٹھیک نہیں ہے تو نیا بنوا لو۔ سیاہی اچھی لگانا اور خوب سونتھ کے چھاپنا۔ سیاہی کم سے کم لگے مگر کالک زیادہ سے زیادہ ہو"۔

جب فرمے چھپ جاتے تو دفتری سے کہتے "احتیاط کے ساتھ فرمے لانا، ہاتھ میلے نہ ہوں۔ کسی لڑکے بالے کو نہ بھیج دینا۔ خود جانا اور فرمے گن کے لانا۔ فولڈ اچھی طرح سے کرنا، صفحہ نمبر کے نیچے صفحہ نمبر آئے۔ آگے پیچھے فولڈ نہ کرنا، ضامنی کر لینا۔ اس کے بعد جزبندی کرنا۔ دھاگا مضبوط لگانا، لپیٹویں جزبندی کرنا۔ پھر اس کے بعد کٹائی بڑی احتیاط سے کرانا، ورنہ کتاب کا ستیاناس ہو جائے گا۔ پھر مضبوط استر استعمال کرنا سریش کے ساتھ ٹائیٹل الٹوانا۔ پھر رات بھر کتاب کو شکنجے میں کس کے رکھنا۔ اس کے بعد ڈسٹ کور احتیاط سے کاٹنا تاکہ فٹ آئے۔ چھوٹا بڑا ہو گیا تو بیڑا غرق ہو جائے گا"۔

یوں جب کتاب اتنی احتیاطوں اور تاکیدوں کے ساتھ تیار ہو کر بازار میں آتی تو سب عش عش کرتے اور چودھری صاحب یوں سوچتے کہ ایک آنچ کی کسر تو پھر بھی رہ ہی گئی ہے ۔

کتاب سازی بڑا ٹیڑھا کام ہے ۔ ہر "بوالہوس" اس کا حق ادا نہیں کر سکتا ۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ کوئلوں کو سیاہی اُس وقت چھوڑتی ہے جب وہ آگ میں داخل ہوتے ہیں ۔

ایک دفعہ ساحر لدھیانوی نے چودھری صاحب سے دس روپے مانگے ۔ مگر چودھری صاحب نے کہہ دیا: "قسمے خدادی[1] ! میرے پاس دس روپلے نہیں ہیں"۔ ساحر نے کہا "میں کل سے خالی جیب پھر رہا ہوں ۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت بھی دس روپلے کا نوٹ آپ کی جیب سے جھانک رہا ہے"۔

چودھری صاحب نے جھٹ جیب پر ہاتھ رکھا "اچھا! نوٹ نظر آ رہا ہے ؟"

"جی ہاں !"

"بڑا چغل خور نکلا ۔ بھئی قصّہ یہ ہے کہ ان روپوں کی مجھے خود بڑی ضرورت ہے"۔

"میں بھوکا ہوں ، اس سے بھی بڑی ضرورت کیا ہو گی ؟"

چنانچہ جانبین میں پانچ پانچ روپوں پر راضی نامہ ہو گیا ۔ جس وقت ساحر کو روپلے ملے ، وہ وقت کھانا کھانے کا نہیں تھا ، چار بجے کا عمل تھا ۔ ساحر نے کہا "اس وقت تو یہی مناسب ہے کہ مُلّاں حسین حلوائی کی دکان پر جا کر آدھ پاؤ گاجر کا

---

[1] "قسمے خدادی" چودھری صاحب کا تکیۂ کلام تھا جس کا استعمال بلا ضرورت بھی ہوا کرتا تھا ۔ اس لیے میں اسے جھوٹ کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتا ۔

حلوہ کھائوں اور کھانا رات کو ڈٹ کر کھایا جائے"۔ یہ کہہ کر ساحر جانب حلوائی چلے۔

ایک دو منٹ کے بعد چودھری صاحب کے صاحبزادے آ گئے۔ چودھری صاحب نے بیٹے سے کہا "دوڑ کے جا، تیرا چاچا مُلّاں حسین دی دکان تے حلوہ کھان گیا ای"۔ چنانچہ صاحبزادے نے ساحر کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ چچا تو حلوہ کھاتا رہے اور بھتیجا پاس کھڑا رہے۔ چنانچہ بھتیجے کو بھی حلوہ کھلایا گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ خود چودھری صاحب بھی پہنچ گئے۔ چودھری صاحب نے کہا۔ "جب آپ لوگوں نے دیر کر دی تو میں نے سوچا کہ ذرا خود چل کے دیکھوں کہ معاملہ کیا ہے؟"

ساحر نے کہا "سوائے اس معاملے کے کہ ہم حلوہ کھا رہے ہیں اور کوئی معاملہ نہیں!"

چودھری صاحب نے کہا "وہ تو میں نے دیکھ لیا مگر یہ تو بتاؤ کہ مُلّاں حسین نے آج حلوہ کیسا بنایا ہے؟"

"کھا کے دیکھ لیں"۔

"نہیں زبانی بتا دو"۔

"یار کھا کے دیکھ لو"۔

"اگر تم زبانی بتا دیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ موجودہ صورت میں تو ــ"

چنانچہ وہ جو پانچ روپے ساحر کو ملے تھے، وہ تو حلوائی کی دکان پر دادا جی کا قصّہ بن گئے۔ جب ساحر نے دیکھا کہ وہ پانچ روپے بھی ہاتھ سے نکل کے منہ میں پڑ گئے تو ساحر نے چودھری صاحب سے کہا کہ "یار معاملہ تو پھر وہی کا وہی ہو گیا"۔

"کیا معاملہ ہو گیا؟"

"جیب خالی ہو گئی"۔

"ساحر تو ہے بڑا اندیدہ۔ تو نہیں دیکھ سکتا کہ میرے پاس بھی پانچ روپلے رہیں"۔

یوں ساحر نے چودھری صاحب سے وہ پانچ روپے بھی نکلوا لیے۔ مگر صورت یہ تھی کہ دونوں خوش تھے، دونوں نے یہ سمجھا کہ حلوہ مفت میں کھا لیا۔ یہ انداز تھے دوستوں کے، یہ چہلیں تھیں دوستوں میں، یہ حق تھا ایک دوسرے پر، یہ طلسماتی فضا تھی آپس میں یاروں کی!

چودھری برکت علی اپنے نام کے ساتھ "بی۔ اے" کا لفظ لکھا کرتے تھے۔ وہی برکت علی جو چودھری نذیر احمد کے چچا تھے اور جنھوں نے انھیں اس کام میں ڈالا تھا۔ پھر بعد میں دونوں چچا بھتیجا کاروبار میں برابر کے حصّہ دار بن گئے تھے۔

برکت علی سیاسی ٹائپ کے آدمی تھے۔ مجلسِ احرار کے سرگرم رُکن۔ جب وہ سیاست کے موضوع پر گفتگو کیا کرتے تھے تو اپنا منہ سُرخ اور دوسروں کا منہ زرد کر دیا کرتے تھے۔ یعنی اتنے غصّے میں ہوتے تھے کہ پناہ بخدا! مگر وہ آدمی اتنے اچھے تھے کہ سبھی اُن سے محبّت کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ چودھری نذیر احمد سے اتفاقاً ہی شوکیس کا شیشہ ٹوٹ گیا۔

پاس ہی چودھری برکت علی صاحب کھڑے تھے اُنھوں نے مُکّہ مار کر دوسرا شیشہ بھی توڑ دیا اور یہ کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے: "تو اگر شیشہ توڑ سکتا ہے تو میں بھی توڑ سکتا ہوں، کیوں کہ میں بھی پارٹنر ہوں"۔ غرض چچا بھتیجا دونوں ہی خوب مزے کے آدمی تھے۔

چودھری نذیر احمد کو فن کاروں سے بڑی محبّت تھی ۔ وہ خوش نویس ہوں تو، سنگساز ہوں تو، پریس مین ہوں تو، وہ اُن کے لیے بچھے چلے جایا کرتے تھے ۔ پھر ان کی اتنی تعریفیں کیا کرتے تھے کہ وہ اُچھل اُچھل جایا کرتے تھے ۔

ایک بار اُن کے چہیتے خوش نویس نے اُن سے کہا "چودھری صاحب! چوکس ہو جائیے، مجھے ایک بڑی رقم کی ضرورت پڑنے والی ہے اور وہ میں لوں گا ضرور، کوئی ہیر پھیر نہیں چلے گی ۔"

جواب میں چودھری صاحب کہتے "اچھا بھئی وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

پھر دو دو چار چار دن کے وقفوں سے محمّد شریف عباسی صاحب برابر یاد بھی کراتے رہے کہ "اب کے ــــ"

جواب میں چودھری صاحب برابر یہی کہتے رہے کہ "وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا ۔"

ایک دن عباسی صاحب بھسکڑا مار کے بیٹھ گئے "لو بھئی آج دے دو وہ رقم!"

چودھری صاحب نے میز سے چیک بُک نکالی ۔ چیک پر تاریخ لکھی، نام لکھا، اپنے دستخط کیے، اس کے بعد شریف عباسی سے کہا "جتنی رقم کی ضرورت ہے، وہ خود بھر لو ۔"

عباسی صاحب چودھری صاحب کے منہ کی طرف دیکھنے لگے، کیونکہ کبھی کبھی تو سو سو دو دو سو روپوں پر بھی تکرار ہو جایا کرتی تھی ۔ لیکن آج ــــ

"ہاں ہاں رقم بھر لے ۔" چودھری صاحب نے کہا ۔

عباسی صاحب نے (۱۹۳۵ء میں) ڈرتے ڈرتے پانچ سو کی رقم

بھری۔ اس پر چودھری صاحب نے کہا "بس ؟"

"یار چودھری (دونوں میں بے تکلفی حد درجہ تھی) آج تو اتنا فیاض کیسے بن گیا ؟"

"شریف ! بات یہ ہے کہ میں تو تم سے روز کام لیتا ہوں لیکن تجھے مجھ سے پہلی بار کام پڑا ہے"۔ دیکھا آپ نے کہ کہاں چودھری صاحب پانچ پانچ روپوں کے سلسلے میں بھی جملہ سوجھ بوجھ کا ثبوت دیتے رہے اور کہاں پانچسو کی رقم کو بھی کم رقم جانا۔ غرض چودھری صاحب بڑے عجیب آدمی تھے۔ گھڑی میں غریب، گھڑی میں بادشاہ۔

آخر میں جاکر چودھری صاحب کو بلڈ پریشر کی شکایت ہوگئی تھی۔ اتفاق کہ شریف عباسی کو بھی اسی مرض نے آن گھیرا۔ دونوں گبھرو جوان تھے، دونوں تحلیل ہونے لگے تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ عباسی صاحب کو ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ چودھری صاحب کو علم ہوا تو عیادت کو پہنچے۔ دونوں ایک دوسرے کی ڈولتی صحت کو دیکھ کر رونے لگے اور ڈھائیں مار مار کر روئے۔ سارا وارڈ غمگین ہوگیا، نم آلود ہوگیا۔

چودھری صاحب نے بہ مشکل تمام پوچھا "شریف کیسے ہو ؟"

"تم بتاؤ تم کیسے ہو ؟"

یہ کہہ کر پھر دونوں رونے لگ گئے۔ یوں یہ دونوں سوائے رونے کے آپس میں کوئی بات نہ کر سکے۔ احباب نے جب یہ صورت دیکھی تو چودھری صاحب کو وہاں سے زبردستی ہٹایا تاکہ کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے۔ احباب چودھری صاحب کو باہر لے جا رہے تھے اور چودھری صاحب کہہ رہے تھے کہ میں کسی ایسے وقت آؤں گا ،

جب یہاں کوئی نہ ہو، تاکہ ہم رو تو سکیں "۔

اُدھر عباسی صاحب کہہ رہے تھے " دیکھ نذیر! میں نے مرض کی حد تک بھی تیرا ساتھ نہیں چھوڑا "۔ یہ سننا تھا کہ چودھری صاحب واپس آئے، پوری قوت سے کہا: " ہٹ جاؤ، سب ہٹ جاؤ ۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا "۔ عجب سماں تھا وہ ۔ رونے والوں میں اب سب شامل تھے، حتیٰ کہ در و دیوار بھی ۔

ایک دن احمد راہی کہہ رہے تھے کہ امرتسر کی عورتیں بڑا اچھا پکاتی ہیں ۔ چودھری صاحب کو تاؤ آگیا ۔ کہا " نہیں، لاہورئیں اچھا پکاتی ہیں "۔ اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ لاہور کی عورتیں اچھا پکاتی ہیں، اُنھوں نے دعوت کر ڈالی ۔

چودھری صاحب نے دو تین قسم کے پلاؤ پکوائے ۔ بڑے طباقوں میں کھانا آیا، بڑی بڑی ڈشوں میں سالن آیا ۔ جتنا کھانا تین آدمیوں نے کھایا، اُتنا اکیلے چودھری صاحب نے کھایا ۔ وجہ یہ بتائی کہ اگر یہ کھانا واپس اندر گیا تو بیوی کہیں گی، "ایسے بے قدروں کے لیے کھانا پکوایا ہی کیوں تھا ؟"

کنہیا لال کپور نے ایک مضمون لکھا ۔ اس میں لکھا کہ " مجھے تین چیزیں بڑی پسند ہیں : دیوندر ستیارتھی کی داڑھی، میراجی کی زلفیں اور چودھری نذیر احمد کی قسمیں!"

جب چودھری صاحب نے وہ ٹکڑا پڑھا تو کہنے لگے : " چودھری کی قسمیں ؟ یہ کیا بات ہوئی ہے ؟"

کپور نے کہا " یہ لفظ قسمیں نہیں بلکہ قِسمیں ہے زیر کے ساتھ!"

" قِسمیں کیا ہوا ؟"

"خدا کی قسمے، ایہہ لفظ وی ہُندا اے۔"

اس چُہل پر چودھری صاحب پہلے تو خُوب ہنسے، پھر کہا تو یہ کہ "میں مُکّا مار کے تیری عینک بھَن دیواں گا، کڈا ایس لفظ نوُں!"

کپور نے کہا "چودھری صاحب! اگر اس لفظ کو بدلا گیا تو سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔" چنانچہ تھوڑی ردوکد کے بعد دونوں ہی اس لفظ کی معنویت پر ایمان لے آئے اور وہ لفظ جُوں کا توُں چھپا "چودھری نذیر احمد کی قسمیں!"

حیب میں نے پہلے پہل ایک ضخیم نمبر چھاپا تو چودھری صاحب میرے پاس بہ طور ہمدردی تشریف لائے۔ کہنے لگے "یہ جو توُ نے اتنا ضخیم نمبر چھاپ ڈالا ہے، یہ تیرے لیے مصیبت بن جائے گا، کیوں کہ میرا زندگی بھر کا تجربہ یہ ہے کہ رسالے کی قیمت تین چار روپے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔"

میں سوچنے لگ گیا کہ یہ اچھا رقیب ہے جو حریف کے نقصان پر بھی پریشان ہوتا ہے۔ مگر میرا جواب یہ تھا "ہمدردی کا شکریہ! مگر میں تجربے اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک کہ جیب اجازت دیتی رہے گی۔"

چودھری صاحب کو مجھ سے، اور ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے قدرے بھنّا کے کہا "کتنی رقم ہے جیب میں؟"

میں نے گزارش کی "میری ایک جیب میں خلوص ہے اور دوسری جیب میں استقامت!"

میرے اس جواب پر قہقہہ مار کے ہنسے۔ وہ پنجاب کی مٹّی کے کڑیل جوان تھے اور میں اُن دنوں کچھ منحنی سا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ جن مجھے ابھی

اپنی ہتھیلی پر بٹھاکر آسمانوں کی طرف اُڑ جائے گا، اقلیموں اقلیموں کی سیر کرائے گا۔ اس کے بعد زمین پر اُتار کر صرف اتنا کہے گا " دیکھ ہم کتنی قدرت کے مالک ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے بھی ادب کی وادی میں پَر جلتے ہیں "۔

ہر چند کہ وہ میرے رقیب تھے ـــــ اُردو شاعری والے رقیب نہیں، بلکہ ادب کی راہوں میں ہم سفری والے رقیب ـــــ مگر اس وقت وہ جس حیثیت میں بات کر رہے تھے، وہ حیثیت ایک مشفق کی تھی۔ وہ غلط حربے استعمال کر کے زک پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ فن کار تھے۔ وہ اینچ پیچ سے مات دینا نہیں چاہتے تھے، وہ مقابلے کے وقت سینہ تان کے کھڑا ہونا جانتے تھے۔

یہ تو تھیں اُن کی کارگزاریاں ادب کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں، یا چند جھلکیاں اُن کی شخصیت کے بارے میں۔ مگر میں یہاں ایک بات خاص طور پر عرض کرنی چاہتا ہوں کہ وہ تو اچھا ہوا کہ اُنھوں نے قلمی اعتکاف کر رکھا تھا، ورنہ وہ بہت سے نقادوں سے اچھے نقاد ہوتے۔

چودھری صاحب اپنے زمانے میں سینے کے زور پر دیوار گرانے والے تھے، بڑے شہ زور اور منہ زور تھے۔ ہاں " ہاتھ زور" بھی تھے۔ غرض جیسا جوانی کا نشہ اُن پر وارد تھا، کم کسی پہ ہوگا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ قدرت نے اُن کی صلاحیتوں کا رُخ صحیح سمت موڑ دیا۔ اگر یوں نہ ہوتا تو وہ ایسے ہوتے جن سے دھرتی کانپتی!

آخر آخر میں جاکر وہ اتنے متقی اور پرہیزگار ہو گئے تھے کہ پانچوں وقت نماز پڑھتے تھے۔ ہر وقت مسجد میں بیٹھے رہتے تھے، ہمہ وقت وظیفہ پڑھتے رہتے

مجھے۔ ملتے تو کہتے "اللہ اللہ کرو بھئی، اللہ اللہ کرو!"

آخری دنوں نہ جانے کس رَو میں، میرے ایک دوست کے ہمراہ تشریف لائے۔ کہنے لگے "میں اب اتنا بیمار رہنے لگا ہوں کہ اُمید کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ میرے دل میں ایک پھانس ہے۔ چاہتا ہوں، آج وہ بھی نکل جائے۔"

"کیسی پھانس؟"

کہنے لگے "تیرے کاموں نے میرے تجربات کو شکست دے دی ہے۔۔ بس یہی اقرار کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ سُن کر میں سنّاٹے میں آگیا، کیوں کہ وہ ٹوٹ سکتے تھے مگر لچک کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یقین کر لیجیے کہ میں اپنی تعریف میں بھی اُن کے منہ سے ایسے کلمات سُننا نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ مجھے اُن کے مرتبے اور اپنی حیثیت کا علم تھا۔

بہر حال میں نے چودھری صاحب کی دل دہی اور اُن کی ڈولتی ہوئی صحت کے بارے میں اتنا ضرور کہا "اللہ آپ کو صحت دے، اس لیے کہ جب قائد نہ ہوگا تو قافلہ اندھیروں میں بھٹک بھی سکتا ہے۔"

بات تمام ہوئی۔

مضمون لکھنے کا ایک انداز تو یہ ہے کہ وہ اتنا سچّا ہو کہ پڑھنے والا اُسے جھوٹ ہی جھوٹ سمجھے۔ ایک انداز وہ ہے کہ وہ اتنا جھوٹا ہو کہ پڑھنے والا اُسے سچ ہی سچ جانے۔ میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ نہ میں ایسا سچ بول

سکتا ہوں اور نہ ہی ایسا جھوٹ ۔ یہی وجہ ہے کہ میں ذہن اور قلم کے درمیان معلّق ہو کے رہ جاتا ہوں ۔ اب چاہے کوئی میری بے بسی پر ترس کھائے، چاہے کوئی نخوت کی پھوار سے بھگو ڈالے ۔ میرا قلم تو صرف اُسی "دشمن" کے لیے رواں ہوتا ہے جس سے مجھے تعلقِ خاطر ہو ۔ ورنہ میں "دوستوں" کو قلم کی پھٹکار کا بھی مستحق نہیں ٹھہراتا ۔

پھر سچّی بات تو یہ ہے کہ کوئی کسی کا دشمن نہیں ہوتا، سوائے اپنی ذات کے!

میرزا صاحب

پھول کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً گلاب کا پھول، اس ایک پھول کے سو رنگ ہیں۔ یہی حال شخصیتوں کا ہے۔ انسان ایک ہے مگر اس کے روپ سو، کہاں کہاں انسان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بس اسی نازک سے فرق کے اظہار کے لیے میں کبھی کبھار قلم اٹھا لیتا ہوں۔

میں عموماً اپنے خاکوں کے عنوان متعین نہیں کرتا کیونکہ عنوان تجویز کر لینے کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے شخصیت کو جان لیا، پہچان لیا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود میرا دل چاہتا ہے کہ آج کی زیرِ بحث شخصیت کو ایک عنوان کے تحت لکھوں۔ اگر یوں سوچوں تو میرے اس مضمون کا عنوان ہوگا "ایک خوبصورت انسان"!

اگر خوبصورتی کا معیار صرف چہرہ مہرہ ٹھہرے تو پھر میرزا صاحب خوبصورت انسانوں میں شامل نہ ہو سکیں گے۔ اگر معیار باطنی اوصاف ہوں تو پھر کسی کو بھی میرزا صاحب کے مدِمقابل کھڑا کر دیجیے مقابلہ حسن خوب ہوگا۔

یہ تقریب میرزا ادیب کے ڈراموں کے مجموعہ "خاک نشین" کے سلسلے میں برپا ہے۔ "خاک نشین" اس کتاب کا ایک ڈراما ہے جو کہ ایک مدرس کے گرد گھومتا ہے، جو

قربانیوں کا مجسمہ ہے۔ جو انسانیت کی معراج ہے۔

جب میں نیاز علی کے کردار کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے وہ نیاز علی نہ ہو۔ دلاور علی ہو جسے زیادہ تر لوگ میرزا ادیب کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ڈرامانگار جس کی اپنی زندگی میں کوئی ڈرامانہیں، جو دھیرے دھیرے زندگی گزارنے کا چلن جانتا ہے، جو خاموش رہو اور کچھ نہ کہو کی عبادت میں مصروف نظر آتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھیں۔ کچھ اپنی کہیں، کچھ اس کی سُنیں۔

رسالے کے مدیر کا کام، دوسروں سے مضامین حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جب کوئی مجھ سے مضمون مانگتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اب کے امام مسجد کے اپنے گھر میں مولود شریف ہوگا کیوں کہ مولوی حضرات دوسروں کے گھروں ہی میں مولود شریف پڑھنے کو ثواب کا کام جانتے ہیں۔

ادارت کو بھی میں ایک بے ڈھنگا سا ہی شغل گردانتا ہوں۔ یعنی طعنے مہنے دو اور طعنے مہنے لو۔ مگر اس کے ساتھ اوٹ پٹانگ سی حرکت یہ کرتا ہوں کہ خاکے لکھتا ہوں۔ جس کسی کا خاکہ لکھا۔ یہ جان کر لکھا کہ دوست ہے۔ مگر عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب خاکہ حاضر کرتا ہوں تو تعلقات غائب ہو جاتے ہیں۔

خدا گواہ میں خاکے لکھنا نہیں چاہتا۔ تنگ میں آ کر تھوڑے سے خاکے ضرور لکھے۔ اس کے بعد جو مجھ سے خاکہ لکھوائی ہوئی ہے۔ وہ میرے لیے پریشانیوں ہی کا باعث ہوئی ہے۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ دوست اصرار کرتے ہیں کہ خاکہ لکھو۔ میں اُن سے کہتا ہوں "بھئی نہ لکھواؤ۔ دوستی کو کمیاب چیز جانو" مگر کوئی مانتا

ہی نہیں۔ کہتے ہیں جو چاہو لکھو۔ مگر میں جو چاہتا ہوں وہ نہیں لکھتا تو بھی دوست ناراض ہو جاتے ہیں۔ کیا کروں؟ مجھ سمیت آج تک ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جسے آئینہ دیکھنے کا سلیقہ ہو۔

میں نے آج تک جتنے دوستوں کے خاکے لکھے۔ اُن کے ساتھ خاصی رعایت برتی۔ مثلاً دوستی کے صدقے میں جو لیکچرر ہوتے ہیں انھیں پروفیسر بنا دیتا ہوں۔ جو پروفیسر ہوتے ہیں انھیں پرنسپل بنا دیتا ہوں۔ خود ہی بتائیں اس سے بھی زیادہ لفظی ترقیاں کیسے دوں؟

خاکہ نویسی بڑا مشکل فن ہے۔ یعنی خدائی حدود میں قدم رکھنے کو خاکہ نویسی کہتے ہیں۔ مثلاً جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہے۔ عین بین اس کے اظہار کو خاکہ نویسی جانیے۔ ایک طرف یہ تقاضے، دوسری طرف مراسم کا پھندا، کوئی کیا کرے کیا نہ کرے۔

ان حالات میں اگر میں میرزا صاحب کی شخصیت پر مضمون لکھوں گا تو بے شک میرزا صاحب مجھ سے قطع تعلق نہ کریں گے مگر ان کی خاموش گفتگو، پرے پرے رہنے والی قربت، میری زندگی کو اجیرن بنا سکتی ہے۔

میں نے ایک مضمون منٹو پر لکھا تھا۔ وہ مجھے اچھا لگا۔ کیوں کہ منٹو کی زندگی دھوپ چھاؤں تھی۔ دھوپ ہی دھوپ، چھاؤں ہی چھاؤں، اس کا دل مومن تھا۔ دماغ کافر، وہ وضو کا اخلاقاً قائل تھا، اشنان کا عادتاً، وہ ترسنے کا قائل نہ تھا۔ ڈوب جانا اس کے مزاج کا خاصا تھا۔ وہ شریف آدمی بھی تھا۔ وہ ممد بھائی بھی تھا۔

اب اپنے میرزا صاحب کی سُنیے۔ یہ اوّل تا آخر شریف آدمی ہیں۔ شرافت کی بھی آخری حد پر، جہاں آدمی شریف کم نیک زیادہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود

میرزا صاحب کو بھی اپنی شرافت کا حدودِ اربعہ معلوم نہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو اولیائی کا دعویٰ کر چکے ہوتے۔

پنجابی میں ایک محاورہ ہے "بھولے بادشاہ" کا۔ میں نے صرف محاورہ سنا تھا۔ مگر بھولے بادشاہ کو دیکھا نہ تھا۔ اپنے محلّے میں ڈھونڈا، اپنے سکول میں ڈھونڈا، اپنے بازار میں ڈھونڈا، مگر مجھے بھولا بادشاہ نہ ملا۔

جب میں نے ادب کی وادی میں قدم رکھا تو مجھے بھولا بادشاہ مل گیا۔ وہ کون؟ وہ اپنے میرزا صاحب اور کون؟ میں ادیبوں اور شاعروں میں "بھولے بادشاہ" کم دیکھتا ہوں۔ مگر دیکھے ضرور ہیں! نام گنوانے کا کوئی فائدہ نہیں، اس لیے کہ میں مضمون میرزا صاحب پر لکھ رہا ہوں۔ بہرحال میں نے میرزا صاحب کا قلمی زائچہ بنایا ہے۔ دیکھیں گے کہ لفظی ستارے کیا کہتے ہیں۔

میرزا صاحب نے شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ سکول کے زمانے میں شعر کہنے شروع کر دیئے تھے۔ پہلے عاصی تخلص رکھا۔ پھر ادیب، اس کے بعد میرزا ادیب بن گئے۔ بہرحال اس وقت مجھے آپ کو یہ بتانا ہے کہ شاعر تھے۔ تائب ہو کر ادیب بنے۔

سکول کے زمانے میں، جو انھوں نے پہلی نظم لکھی تھی۔ اس کے ایک دو شعر آپ بھی سُن لیں۔ طبع آزمائی کی تھی بکری پر! ایک شریف الطبع قسم کا جانور! بہرحال شعر سُنیے:۔

میں نے دیکھی ہے آج اِک بکری ۔۔۔ دُودھ دیتی ہے گھاس کھاتی ہے
پیار سے میرے پاس آتی ہے ۔۔۔ جب پکڑتا ہوں بھاگ جاتی ہے

میرزا صاحب نے بکری پر نظم کیا لکھی کہ اپنی ساری زندگی اس نیک سرشت مخلوق کی طرز پر گزار دی ۔ ذبح کر ڈالیے ۔ ذبح ہو جائیں گے ۔ نام دلاور ہے مگر دلاوری سے کوئی رشتہ خاطر نہیں ۔

بہ حیثیت ادیب ، ان کا مرتبہ خاصا اُونچا ہے ۔ ہزاروں لکھنے والے ، ان کے قلم کی سحر آفرینیوں سے متاثر ہوئے ہوں گے ۔ انداز ملاحظہ ہو ۔ صرف ایک پیرا جو اُنھوں نے اپنی آپ بیتی حسرتِ تعمیر میں لکھا ہے :

" ماضی تو ہمارے لیے ایک ایسا تودۂ برف ہے ۔ جس کا صرف ایک حصّہ سمندر کی سطح کے اوپر دکھائی دیتا ہے اور باقی اس کا سارا وجود نیچے گہری اور منجمد تاریکیوں میں ڈوبا رہتا ہے اور پھر یہ بھی دیکھیے کہ یہ تودۂ برف ہے جو ہر آن بڑی آہستگی سے غیر محسوس طور پر اپنا آپ پانیوں میں گم کرتا رہتا ہے ۔ وقت کے سمندر میں ماضی کا بڑے سے بڑا پہاڑ بھی چپ چاپ نیچے ہی نیچے ڈوبتا رہتا ہے ۔"

یہاں ایک سوال یہ ذہن میں اُبھرتا ہے کہ آخر انھوں نے اپنی آپ بیتی کا نام "حسرتِ تعمیر" ہی کیوں تجویز کیا ۔ وہی بات کہ ہر بات میں قنوطیّت ! قنوطیت بُری چیز ہو گی ۔ مگر یہ وصف ہر شریف آدمی کا مقدّر کیوں ؟

ادب میں دو تین میرزا پہلے بھی گزرے ہیں ۔ ایک میرزا غالب ، دوسرے میرزا یگانہ ، اور بھی میرزا ہوئے ہوں گے مگر ہمارا کام دو تین میرزاؤں کے حوالے سے بھی چل جائے گا ۔ میرزا غالب جو تھے ۔ وہ ہر چیز کا روشن پہلو ہی سامنے رکھتے تھے قنوطیت نام کی چیز نہ تو اُن کے کلام میں ملتی ہے اور نہ ان کے افعال میں ، وہ تو ایک دیدلے

کے آدمی تھے۔ چونکہ لڑتے تھے اور سی نہ کرتے تھے۔ میرزا یگانہ جو تھے، وہ چنگیزی تھے وہ بھی اپنے جلال اور تُند خوئی کی بناء پر خاصے بدنام تھے بلکہ نیک نام تھے۔ ہر وقت انگارے ان کی زبان پر تھے۔ بھڑا دو ساری دُنیا سے وہ تیار، مگر یہ اپنے میرزا صاحب کیسے میرزا ہیں ؟ پہلے میرزاؤں کی بھی، اپنی نرم روی، اپنی صُلح جوئی کی بنا پر ناک کٹوا کے رکھ دی !

سُنا ہے کہ میرزا صاحب اپنی بیگم سے ڈرتے ہیں۔ جب یہ بات پھیلی اور میرزا صاحب کی بیگم نے، ذرا تیوروں کے ساتھ، میرزا صاحب سے باز پُرس کر ڈالی کہ "یہ کیا تم میرے خلاف پراپگینڈا کرتے رہتے ہو"، تو میرزا صاحب کا فدویانہ جواب یہ تھا" عجّو کی ماں! میں کوئی آپ سے ڈرتا ہوں، جو لوگوں سے کہوں گا کہ ڈرتا ہوں"۔

میرزا صاحب اپنی بیگم سے ڈرتے ہیں یا نہیں، اللہ جانے یا میرزا جانے۔ مگر انھیں بیگم سے محبّت ہے بے پناہ، جب وہ ایک بار بیمار ہوئیں۔ شدید بیمار، تو بیگم سے زیادہ یہ خود بیمار نظر آتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں کی بجائے پچیس گھنٹے تیمار داری کی، چوبیس گھنٹے سب کے سامنے، ایک دو گھنٹے عالمِ خیال میں! دعائیں مانگ مانگ کر بیگم کو عالمِ بالا سے واپس لے ہی آئے۔ قدرت کو ان کی تپسیا پر پیار آگیا۔ ایڈیٹروں کے رومان بڑے مشہور ہیں۔ کچھ سچّے کچھ جھوٹے۔ بہر حال یہ برادری اس میدان میں نیک نام ضرور ہے۔ اپنے میرزا صاحب کو بھی" ادبِ لطیف" کی ایڈیٹری کے پہلے ہی دن عشق قسم کی چیز لاحق ہوگئی تھی۔ واقعہ انھی کی زبانی سُنیئے:

" جب تک آدمی جاگتا رہتا ہے۔ دن بھر کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں اور میرے ذہن میں بھی یہی مناظر آتے تھے اور چلے جاتے

تھے۔ اسی اثنا میں دفتر کا خیال آگیا اور اس خیال کے آتے ہی وہ دیوار والا چہرہ آنکھوں تلے پھر گیا۔ چند لمحے ہی تو اسے دیکھا۔ چند لمحوں میں کوئی کسی کو کیا دے سکتا تھا۔ مگر یہ چہرہ میرے سامنے آیا تو میں اُسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔"
بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی گونگی تھی جو ان کے کئی افسانوں کا کردار بنی۔ قصّہ یہ ہے کہ ان کے عشق کے ساتھ کوئی نہ کوئی ٹریجڈی ضرور ہوتی رہی ہے۔ یہ میرا گمان ہے۔ یہ میرا مشاہدہ نہیں!

میں نے نقوش کا کوئی خاص نمبر چھاپا۔ بڑے فخر سے میرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ رسالے کی ورق گردانی کرتے رہے۔ جب میں نے محسوس کر لیا کہ اب انھیں مندرجات وغیرہ سے، رسالے کے معیار کا اندازہ ہو گیا ہو گا تو میں نے دریافت کیا۔ کیسا رہا پرچہ؟ ان کا جواب یہ تھا۔ "ٹائیٹل اچھا ہے۔"

میں اس تبصرے پر تلملا کے رہ گیا، کچھ کہہ نہیں سکتا تھا، کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ جونیئر اور سینئر کا معاملہ تھا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد، یہ ادبِ لطیف کا سالنامہ لے کے آ گئے۔ معاً میرے ذہن میں ان کا وہ فقرہ آن دھمکا، دل نے کہا۔ کاش میرزا صاحب بھی مجھ سے پوچھ لیں کہ پرچہ کیسا ہے؟ چنانچہ اُنھوں نے پوچھ ہی لیا۔ "پرچہ کیسا ہے؟" میں نے اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کر ڈالا۔ "اس کا تو ٹائیٹل بھی اچھا نہیں۔"

ایسی چہلیں اپنی جگہ، مگر جب میں اسکول میں پڑھتا تھا، اُن دنوں دو رسالوں کی بڑی دھوم تھی۔ ایک رسالہ تھا "نیرنگِ خیال" دوسرا "ادبِ لطیف"۔ یوں تو رسائل اور بھی بہت سے تھے۔ ہمایوں، شاہکار، ادبی دُنیا، عالمگیر۔ یہ سب

رسائل اپنی جگہ قدر و قیمت رکھتے تھے۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں کہ مجھے ان سب رسائل میں نیرنگِ خیال اور ادبِ لطیف سے دلچسپی تھی یا اُدھر نیاز فتحپوری کے "نگار" سے!

"نگار" کیوں پسند تھا؟ وہ اس لیے کہ نیاز تنہا ایسا شخص تھا جو چو مکھی لڑ سکتا تھا۔ پھر اس کے قلم میں جادو تھا۔ "نیرنگِ خیال" مجھے اس لیے پسند تھا کہ اس کی پالیسی میں وہ اعتدال تھا جو سب کے لیے قابلِ قبول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے اہلِ قلم کی شاہکار تحریریں اس میں چھپیں۔

"ادبِ لطیف" کا گرویدہ اس لیے تھا کہ وہ نقیب تھا مستقبل کا، جنم داتا تھا ایک تحریک کا، ادبِ لطیف نے ذہنوں کو شعور بخشا تھا۔ ادبِ لطیف نے حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ ادبِ لطیف نے ادب کو گل و بلبل کے چکر سے نکال کر، دار و رسن تک کی ضرورت کا احساس دلا دیا تھا۔

پہلے پہل وہ راستہ میرزا ادیب ہی نے دکھایا تھا۔ خود راہیں کاٹی تھیں۔ خود لہولہان ہوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں آنے والے اُس راستے پر دندنانے چلے مگر ابتدا میں ادب کی یہ کھیتی میرزا ادیب ہی نے اپنے خوُن سے سینچی تھی۔

یہ ضروری نہیں کہ جو پودا لگائے، وہ اس کا پھل بھی کھائے۔ بے شک کچھ کاریگر لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پودا ہی اس نیّت سے لگاتے ہیں کہ پھل بھی خود کھائیں گے۔ ان میں ایسی ہوشمندی ہے ہی نہیں۔ یہ تو دوسروں کی ہوشمندیوں کا نشانہ بنتے آئے ہیں۔ یہ شخص مات اس لیے کھاتا ہے کہ دوسرے اپنی فتح مندیوں کے جھنڈے گاڑ سکیں۔ یہ شخص پیچھے اس لیے ہٹتا ہے تاکہ دوسرے آگے بڑھ سکیں۔

یہ مرنجاں مرنج قسم کا شخص جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے اُردو ادب کا دیوتا ہے اور مجھ ایسے کئی اس کے پجاری!

میرزا صاحب موڈ کے آدمی ہیں مگر موڈ ہمیشہ مائل بہ شائستگی ہی ہوتا ہے۔ وہ موقع کم آتے ہیں کہ جیسے "مُردہ بولے تو کفن ہی پھاڑے" کہتے ہیں۔ مگر بات یہ بھی نہیں کہ صرف درگزر کے پیغمبر ہوں۔ رُوبرو کھری بات کہتے ہیں اور دھڑلّے سے کہتے ہیں خواہ عمر بھر کے لیے تلخیاں ہی جھولی میں کیوں نہ پڑ جائیں۔

ایک ایسے ہی موقع پر، ایک شاعر کے بارے میں کہہ دیا کہ اُن کی ترقی کا راز عورتیں ہیں کہ جنھیں زینہ بنا کر بامِ شہرت تک پہنچے۔

اُس وقت میرزا صاحب کا مفہوم نہ جانے کیا تھا۔ کوئی بھلا ہی ہوگا۔ اس لیے کہ میرزا صاحب شر پسند انسان نہیں۔ غالباً اُن کا مفہوم یہ ہوگا کہ مشہور گانے والیوں نے ان کی غزلیں گائیں اور وہ بامِ شہرت تک پہنچے۔ یہ فقرہ اُن کی زبان سے ادا ہونا تھا کہ زندگی بھر کے لیے ٹھن گئی۔ وہ خفا یہ حیران!

مندرجہ بالا حوالہ تو ایک دوسری ہستی سے متعلق ہے۔ ایک واقعہ اس فدوی سے متعلق بھی ہے۔ کہیے تو وہ بھی سُنا دوں؟ دوسروں ہی کی بات کیوں؟ اپنی کیوں نہیں؟

قصّہ یہ ہے کہ میرزا صاحب کے ذہن میں کوئی بات بیٹھ جائے تو پھر آپ کی نہیں سُنیں گے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ان کے ذہن میں یہ بٹھا دے کہ خدا نہیں ہے تو پھر انھیں خُدا بھی قائل نہ کر سکے گا ہیچ اور سچّے ہیں۔ بس خدا نہیں ہے تو نہیں ہے۔

ایک میٹنگ میں مختلف مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی اور وہ گفتگو ریکارڈ ہو رہی

تھی۔ اُس دن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرزا صاحب زندگی بھر کی باتیں مجھ سے آج ہی کہیں گے۔ میں چُپ، میں حیران!

پھر وہ معاملہ ایجنڈے میں بھی نہ تھا۔ بھلا ایک خاتون کا معاملہ ایجنڈے میں کیسے آسکتا تھا۔ ہُوا یہ کہ ایک خاتونِ لاہور قسم کی شے نے ان کے کان بھر دیئے چنانچہ یہ مناظرے کے لیے تیار! میرزا صاحب کی ایک ادا یہ بھی ہے کہ یہ صنفِ لطیف کو جھُوٹا سمجھ ہی نہیں سکتے۔

اپنا ایماندارانہ خیال یہ ہے کہ اس صنف کی تو ساری شان ہی لگائی بجھائی میں ہے۔ اس وصف کو نظر انداز کر دیجیے گا یا چھلوں کا مارجن نہ دیجیے گا تو پھر عورت، عورت نہ رہے گی۔ مرد بن جائے گی۔

میں کہتا تھا "میرزا صاحب معاملہ یوں ہے"۔

میرزا صاحب کہتے تھے "بھلا خاتون جھُوٹ بول سکتی ہے"۔

بہرحال! میں نے یہ کہا تھا۔ خاتون یہ کہتی تھی۔ اس بحثا بحثی میں کافی وقت گزر گیا۔ میں نے تنگ آکر، بہ طور قصّہ کوتاہ یہ کہا "میرزا صاحب نہ اُس عورت سے میرا نکاح ہو سکتا ہے اور نہ آپ کا، پھر یہ تکرار کیسی؟ اس پر میرزا صاحب لجا کر مسکرا دیئے اور بہت سا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

میرزا صاحب عموماً چائے پینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگر اصرار کیا جائے تو ایسی لجاجت سے منتیں کرتے ہیں جیسے ان سے چائے کے لیے نہیں بلکہ شراب کے لیے کہا جا رہا ہو۔

ایک دن تشریف لائے۔ میں نے کسی سے چائے لانے کے لیے کہا۔ اُنھوں

نے پھر منت آمیز انداز میں انکار کر دیا۔ میں نے کہا "آج تو چائے پلا کے چھوڑوں گا"۔

میرزا صاحب نے وضاحت کی "میں صبح سے تین کپ پی چکا ہوں"۔

میرا جواب یہ تھا "آپ کو چوتھا کپ بھی پینا پڑے گا"۔

اگر تیور خطرناک ہوں تو پھر میرزا صاحب میدان میں نہیں ٹکتے۔ مطلب یہ کہ چوتھا کپ پینا پڑتا ہے۔

میرزا صاحب فطرتاً قنوطی ہیں۔ اعلیٰ پائے کے قنوطی، ڈر اور خوف ہر وقت مسلط، کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے کے چکر میں، مگر کبھی کبھی اپنے اوپر خوشدلی کا بھی نقاب اوڑھ لیتے ہیں۔ پھر اتنے قہقہے لگاتے ہیں کہ مجلس میں سب سے اونچے قہقہے اسی صحرانورد کے ہوتے ہیں۔

موڈ میں ہوں تو یہ بھی کہتے ہیں "اٹھو بھئی! آج تمہیں عیش کرا دوں"۔

"عیش؟"

"ہاں عیش!"

چنانچہ کسی ہوٹل میں لے جائیں گے۔ بیرے سے کہیں گے "سموسے لاؤ"

بیرا پوچھے گا "کتنے؟"

میرزا صاحب کا جواب یہ ہو گا کہ "ایک تو میں کھاؤں گا" (پھر مخاطب سے "آپ کتنے؟"

ایسے ہی ایک موقع پر ایک چُلبلے دوست نے کہہ دیا "بیس[۲۰]!"

"اکٹھے بیس[۲۰]؟ یہ صحیح ہے کہ مجھے ریڈیو اسٹیشن سے پچیس روپے کا چیک ملا ہے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اکٹھے بیس سموسے کھا جاؤ"۔

میرزا صاحب کے لیے وعدہ ایفائی زندگی کا ایک چلن ہے جس کی تکمیل ضروری، چاہتے ہیں کہ جو وعدہ کیا جائے اُسے پورا کیا جائے۔ خواہ اس کے لیے زحمت ہی کیوں نہ اُٹھانی پڑے۔ وہ اس راہ میں ہر قدم پر ثابت قدم۔

مجھ سے اُنھوں نے ایک بار وعدہ کیا کہ ایک ہفتہ تک مضمون پہنچا دوں گا۔ جب وہ دن آیا تو اُس دن لاہور میں کرفیو اور مارشل لا، دونوں ہی تشریف فرما تھے بقول غالب جزتیلی بندوبست تھا۔ خوف و ہراس کی فضا، صرف چند گھنٹوں کے لیے کرفیو کے اوقات میں نرمی برتی جاتی تھی۔ تاکہ جس کا کوئی مر گیا ہے وہ اُسے دفنا دے یا جسے زندہ رہنے کے لیے کوئی ضروری چیز خریدنا ہو تو وہ خرید سکے۔

دیکھا کہ میرزا صاحب موجود، بڑے جوش سے بغلگیر ہوئے۔ کہا۔ وعدہ کر رکھا تھا۔ کرفیو کی پابندی نرم ہوئی تو مضمون لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔"

میں نے کہا" بھائی! مضمون پھر آجاتا۔"

کہا" وعدہ کر رکھا تھا۔"

اس دَور میں ایسے لوگ کمیاب ہیں جو اپنی ذات میں اتنے گڈّو ہوں۔ گڈّو کا لفظ میں نے گڈّو کے خاندان کا ایک رشتے دار جان کر لکھا ہے۔ ویسے یہ پیار میں گڈّو اپنے نواسے کو کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عمر کے اتنے فرق کے باوجود، دونوں میں لمبا چوڑا فرق نہ ہو گا۔ دونوں کی خواہشیں چھوٹی چھوٹی، دونوں کی آرزوئیں معصوم معصوم!

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرزا صاحب کرفیو اور مارشل لا میں بھی مضمون لے کر آ گئے۔ ظاہر ہے کہ اس موضوع پر گفتگو بھی ہونا تھی۔ سو ہوئی!

ہم لوگ جو ادیب ہوتے ہیں۔ عجیب ہوتے ہیں۔ ہم میں سوائے" ہم" کے

باقی خیر ہی خیر ہے ۔ ہم استغنا پر آتے ہیں تو فرشتے بھی رشک کرتے ہیں سر سید احمد خاں اتنے بڑے آدمی تھے کہ شاید و باید، پاک و ہند کی تاریخ میں مسلمانوں کے حصّے، دو چار ہی تو چاند آئے ۔ اُن میں ایک سر سیّد احمد خان !

قوم نے اُن پر لاکھوں روپے نچھاور کیے ۔ پائی پائی اُنھوں نے بھی قوم کی بہبود پر صرف کر دی ۔ جب انتقال ہوا تو کفن کے لیے کوڑی تک نہ تھی ۔ نواب محسن الملک نے سر سیّد احمد خاں کو " آخری چندہ " کہہ کر پچاس روپے دیے تا کہ کفن دفن کا انتظام ہو ۔

ہاں تو صاحب ! ملک کی موجودہ فضا پر بات ہوئی ۔ بیچ میں قصّہ اور نکل آیا ، (ایک دردمند ادیب کا) اس لیے کہ ادیب ماحول سے بے نیاز ہو کر نہ ادبی طور پر زندہ رہ سکتا ہے اور نہ جسمانی طور پر ، وہ بُرے حالات میں گھُلتا ہے اور گھُلتا ہی رہتا ہے ۔

" یار مسجد میں گھُس کر، مسلمانوں کو مارا گیا ۔ متعدد لوگ مر گئے ۔"

" بھائی ! وہ واقعہ بھی سُنا کہ میکلوڈ روڈ پر، ایک دفتر کو آگ لگا دی گئی ۔ کئی لوگ بھسم ہو گئے ۔"

ہم بغیر رُو رعایت اور بغیر کسی پارٹی کی طرف داری کے " انسان پارٹی " کے طرف دار تھے ، جو کوئی مر رہا تھا ۔ وہ کسی کا باپ تھا ۔ بیٹا تھا ۔ بھائی تھا —— اور اُن سب سے ہمارا رشتہ تھا ۔

یہ سب ہنگامہ کیوں ؟ مارشل لا کیوں ؟ ہوا یہ کہ مُلک میں انتخابات ہوئے ۔ ایک پارٹی نے کہا " ہم نے الیکشن جیت لیا ۔" دوسری نے کہا " دھاندلی ہوئی ۔" نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ سڑکوں پر نکل آئے ۔ گولیاں کھانے لگے ۔

ایک طرف حکومت ہے، دوسری طرف حزب اختلاف، کرسی پر نظر دونوں کی ہے۔ مگر انسان کے خون پر نظر کسی کی بھی نہیں مسلمان کا خون ہمیشہ سے سستا رہا ہے اور اس دور میں بے حد سستا ہے۔ سُنا ہے کہ خون کا سب سے بڑا بیوپاری امریکہ ہے۔

خون سے یاد آیا اور ایک قصاب نے بتایا کہ وہ قصائی جو منڈی میں روز بکرے ذبح کرتا ہے وہ چار پانچ برس کے بعد اندھا ہو جاتا ہے۔ پھر دوسرا قصائی آتا ہے وہ بھی چار پانچ برس کے بعد اندھا ہو جاتا ہے۔

میں نے پوچھا "بھئی کیوں؟"

"خون دیکھ دیکھ کر!"

پھر اُس نے یہ بھی بتایا کہ ہر قصائی کی آخری عمر، بڑی کسمپرسی میں گزرتی ہے۔ چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزرتی ہے مگر اس کی جان نہیں نکلتی۔

میں نے مزید معلومات کی خاطر پوچھا "بھائی! سارے قصائیوں کا تو یہ حال نہ ہوتا ہوگا؟"

اُس نے بتایا۔ عموماً سارے قصائیوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ مرنا چاہتے ہیں مگر مر نہیں سکتے۔ جو قصائی اس حال سے نہیں گزرتا وہ لوگوں کی نفرتوں کا نشانہ بنتا ہے۔ خاندان کا ایک ایک فرد اس سے نفرت کرتا ہے۔ انجام بہر حال بہ خیر نہیں ہوتا۔

افوہ! میں تو مضمون لکھ رہا تھا میرزا ادیب پر، جو اتنا رقیق القلب ہے کہ ایک چیونٹی کے گلے پر بھی چھُری نہیں پھیر سکتا۔ مگر ذکر آن نکلا خون کا، قصائی کا، آپس میں کیا مناسبت ہے کیا تُک، دیکھا جائے تو دُنیا میں کس بات کی تُک ہے جو یہاں تُک

کی پریشانی میں مبتلا ہوا جائے ۔ اس دور میں ہر شخص کے ہاتھ میں چھُری ہے۔ چاہے وہ کوئی ہو۔ دکاندار ہو، دفتر کا بابو ہو، کارخانہ دار ہو، مزدور ہو، گدی نشین ہو کرسی نشین ہو!

یہ قوم جس کا ماضی بڑا شاندار تھا۔ آج کل ایک بہت بڑی کٹھالی میں پڑی ہے۔ کندن بننے سے پہلے بھسم ہونا پڑتا ہے۔ خاکم بدہن کیا ہم بھسم ہونے کے عمل سے گزر رہے ہیں ؟

جس طرح بُرے لوگوں سے اچھائیوں کی امید نہیں ہوتی اُسی طرح اچھے دوستوں سے برائیوں کی توقع نہیں ہوتی ۔ بہر حال میرزا ادیب ایسے دوست ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان سے برائی کی توقع رکھنا ایسے ہی ہے جیسے پانی کو آگ لگا دینا۔

صرف اسمبلیوں ہی کے الیکشن نہیں ہوتے۔ رائٹرز گلڈ کے بھی الیکشن ہوتے ہیں ۔ بالکل اُنہی بنیادوں پر، جن بنیادوں پر، اسمبلیوں کے الیکشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ صاحب ہم نے بھی الیکشن لڑا تھا۔ میں نے "مرکزی اسمبلی" کا ، میرزا صاحب نے "صوبائی اسمبلی" کا ۔

حریف عجیب نکلے۔ یعنی ہر حرکت روا ، ہر حرکت ایمان ، چونکہ وقت گزر چکا ہے اس لیے میں گڑے مُردوں کو نہ کہوں گا کہ اُٹھو اور بیان دو۔ چونکہ الیکشن کے ایک واقعہ سے میرزا صاحب کے کردار کا واسطہ ہے ۔ اس لیے بچ بچا کے عرض کروں گا ۔

ہمارے الیکشن کے دنوں میں، مخالف فریق نے ایک سُبک حرکت یہ کی کہ میرزا صاحب کی طرف سے اخباروں میں ایک بیان نکلوا دیا کہ میں یعنی میرزا ادیب رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ

سے مستعفی ہوتا ہوں۔ اس لیے کہ دھاندلیاں ہو رہی ہیں۔

یہ خبر اخباروں میں چھپی۔ چونکہ میں سیکرٹری جنرل کا امیدوار تھا اور میرزا ادیب ایسے مخلص ارکان ہی نے مجھے اس امر پر آمادہ کر لیا تھا کہ انتخاب لڑوں۔ اس لیے یہ خبر بڑی حیرت سے پڑھی گئی۔ جس نے پڑھا۔ اس نے مجھ سے ہمدردی کی اور میرزا صاحب سے شکایت!

میں سب سے کہتا "یہ خبر مخالف فریق کی طرف سے چھپوائی گئی ہوگی۔ چونکہ میرزا صاحب کی ذات پر اعتماد تھا۔ اس لیے میں قدرے مطمئن تھا اور میرے ساتھی خاصے پریشان! چنانچہ طے پایا کہ اُٹھو اور میرزا صاحب سے چل کر پوچھیں۔

جب ہم میرزا صاحب کے ہاں پہنچے تو وہ بے شک پریشان تھے۔ انہوں نے کہا۔ "مجھے اس بات سے بھی دُکھ ہوا ہے کہ میرے نام سے ایک غلط خبر چھاپی گئی اور اس وقت مجھے اس بات پر بھی دُکھ ہوا کہ دوستوں کو میرے خلوص پر شُبہ ہوا۔

میرزا صاحب بہت پیدل چلتے ہیں۔ یہ عادت ان کی صحت کا باعث بھی ہے اور روپے پیسے کی بچت کا بھی، یہ ایک آدھ میل پیدل نہیں چلتے بلکہ میلوں میل اور چل سو چل!

عموماً یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس مارچ میں ان کا کوئی ساتھی بھی ہو۔ جو لوگ جانتے ہیں کہ میرزا صاحب چلا چلا کے ہلکان کر دیتے ہیں۔ وہ "ببر" کے نام پر بھی کنی کاٹ جاتے ہیں۔

ایک دن ایک نیا شخص پھنسا۔ اتفاق سے وہ میرا دوست بھی تھا۔ اس کی حالت کافی غیر تھی۔ میں نے پوچھا "خیریت؟"

کہنے لگے "مرزا صاحب نے سیر کرا دی"۔ میں معاملہ بھانپ گیا۔ پھر بھی خوش وقتی کے لیے پوچھا "آخر کہاں کی؟"

کہنے لگے "مرزا صاحب بھاٹی گیٹ کے چوک میں مل گئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی زور کا نعرہ لگایا "آخاہ! خوب ملے۔ مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا"

میں نے پوچھا "کیا کام؟"

کہنے لگے "میرے ساتھ چلیے بتاتا ہوں"۔ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ جب میو ہسپتال کے پاس پہنچ گیا تو میں نے عرض کیا "خیر خیریت آپ نے پوچھ لی۔ مالی حالت کے بارے میں آپ نے استفسار کر لیا۔ لکھنے لکھانے کے متعلق آپ نے دریافت فرما لیا۔ اب تو بتا دیجیے۔ آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟"

ابھی بتاتا ہوں۔ ابھی بتاتا ہوں۔ کہتے ہوئے پھر ساتھ لے لیا۔ جب میں میکلوڈ روڈ کے پاس جا کر رک گیا تو میں نے کہا "پہلے کام بتائیے پھر آگے چلوں گا تو مرزا صاحب نے مجھے گھسیٹتے ہوئے کہا۔ بس ابھی بتاتا ہوں۔ ساتھ ہی نکتہ یہ بھی سمجھایا کہ آپ کا یوں رکنا اور میرا اس طرح گھسیٹنا بہت سی غلط فہمیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ چنانچہ میں مرزا صاحب کی باتوں میں پھر آ گیا اور چلتا چلا گیا۔ چلتے چلتے جب ریڈیو اسٹیشن قریب آ گیا تو مرزا صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملا دیا۔

میں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا "کیا مطلب؟"

مرزا صاحب کا جواب یہ تھا "بس مجھے یہیں تک پہنچنا تھا"۔

مرزا ادیب صحیح معنوں میں ادیب ہیں۔ اس ملک میں کوئی شاعر ہے اور کوئی افسانہ نویس اور کوئی مضمون نگار مگر ادیب برائے نام ہیں۔ میں ادیب اُسے سمجھتا ہوں

سو نگارش کی جملہ اصناف پر حاوی ہو۔ جیسے غلام رسول مہر یا نیاز فتحپوری۔ میں یہاں رتبوں کی بات نہیں کر رہا، جہتوں کی بات کر رہا ہوں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرزا ادیب مکمل ادیب نہیں۔ اس لیے کہ شاعر نہیں ہیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ میرزا صاحب شعر کہہ سکتے ہیں مگر نہیں کہتے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح بعض شاعر شعر نہیں کہہ سکتے مگر کہتے ہیں۔

میرزا ادیب کیا ہیں اور ان کا ادبی مقام کیا ہے؟ اس کا اندازہ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا۔ ابھی تو اندازہ انہی ادیبوں کا لگایا جا سکا ہے جو سرکار دربار میں رسائی رکھتے ہیں۔ یہ دور اُن کا ہے۔ یہ دَور میرزا ادیب کا نہیں۔ کیونکہ سچے ادیب کا المیہ یہ ہے کہ اُن کی زندگی کا تعین، ان کی موت کے بعد ہوتا ہے۔

میرزا صاحب کو زمانے بھر سے شکائتیں ہیں، شکایتوں کا پشتارہ ہلکا نہیں ہو رہا بلکہ بھاری ہی ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی کچھ کہے، میں تو ان کو شکایتوں میں حق بجانب ہی پاتا ہوں۔ اس لیے کہ زمانے نے ان کو دیا کیا ہے؟ یہ اس دَور میں فٹ نہیں ہیں کیوں کہ یہ زمانہ کسی کو بھی اس کا حق نہیں دیتا۔ یہ دَور تو اپنا حق بہ زور منوانے کا ہے۔ یہ دَور مانگنے کا نہیں، چھین لینے کا ہے۔ یہ دور انکساری کا نہیں، طنطنے کا ہے۔ جو یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ میرزا ادیب بن جاتا ہے۔

میں نے ایک دن سُنا کہ میرزا ادیب کو ریڈیو والوں نے سبکدوش کر دیا۔ اگر میرزا ادیب کو ایک فالتو آدمی سمجھا جا سکتا ہے تو یہ ارباب حکومت کی اپنی بے تدبیری ہے۔ کیا حکومت یا اس کے ماتحت چلنے والے نیم سرکاری ادارے یہ چاہتے ہیں کہ ان کے قلم کو زنگ لگ جائے؟ کیا حکومت یہ چاہتی ہے کہ ان کا قلم سو جائے؟

یہ شخص جس کے قلم کی دھوم پاک و ہند کی سرحدیں عبور کر کے بیرونی دنیا تک پہنچ چکی ہے۔ وہ شخص اگر اس ملک میں اکھڑا اکھڑا سا ہو تو وہ صرف حیران ہو سکتا ہے اور حیران ہونا اس دَور میں ہر قابلِ ذکر شخصیت کا مقدر بنا دیا گیا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ اورنگزیب سے شاہجہان نے قید میں بھی یہ کہا تھا کہ مجھے پڑھانے کے لیے کچھ بچّے بھیج دیجیے۔ اس پر اورنگ زیب نے کہا تھا معلوم ہوتا ہے ابھی تک بادشاہت کی بُو نہیں گئی۔

ہم آزاد ہیں یا قید؟ اس ذکر کو ہم کیوں چھیڑیں۔ کیوں کہ آزادی کے مفہوم کئی ہیں۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ کوئی دوسرا ملک حکمران نہ ہو۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ آزادی حالات و واقعات کی اساس پر ہوتی ہے۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ آزادی سُکھ کے سانس کی ہوتی ہے۔ بہر حال اس بحث میں ہم نہیں پڑتے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ کوئی اورنگزیب ہمارے ہاتھ سے قلم نہ چھینے!

ویسے میرزا صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔ انھیں اکثر عجائب گھر میں جلتے دیکھا گیا ہے۔ یاروں نے ٹوہ لگائی، آخر یہ عجائب گھر جا کر کیا کرتے ہیں؟ معلوم ہوا یہ اُس ہال میں پہنچ جاتے ہیں جہاں مہاتما بدھ کے مجسمے پڑے ہیں۔ سماں یہ ہوتا ہے کہ بُت کے سامنے بُت سے بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔

جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آخر آپ یہاں اتنا زیادہ کیوں آتے ہیں؟ تو ان کا جواب یہ تھا "مجھے یہاں سکون ملتا ہے"۔

آخر ایک دن مہاتما بدھ کا مجسّمہ بول ہی پڑا ـــ ہو سکے تو میرے بُت کو اُٹھاؤ اور مجھے کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں مجھے بھی سکون مل سکے۔

وقار صاحب

یہ ذکر ۱۹۵۰ء کا ہوگا۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ سید وقار عظیم نے "ماہِ نو" کی ادارت چھوڑ دی ہے اور ان کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں ہوگیا ہے۔ اُس وقت تک میں سیّد صاحب سے ملا نہ تھا۔ مگر مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی تھی۔

پھر ملنے کی آرزو نے زور پکڑا۔ میں نے اِدھر اُدھر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ پروفیسر حمید احمد خان کے ہاں ٹھہرے ہیں۔ چنانچہ اُدھر جا نکلا۔

گھنٹی بجائی۔ نوکر نے پوچھا "کس سے ملنا ہے؟"

میں نے بتایا۔ "سیّد وقار عظیم سے"!

نوکر ڈرائنگ رُوم میں بٹھا کر چلا گیا۔ سیّد صاحب تشریف لائے۔ میں اُن کے خدوخال کا ذکر نہ کروں گا۔ کیونکہ وہ اپنی صورت سے زیادہ خوبصورت انسان تھے۔ اُنھوں نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ میں محسوس کرنے لگا کہ یہ شخص تو میرا اپنا تھا۔ مگر مجھ سے دُور تھا۔

وہ لوگ جو ان سے دُور تھے۔ وہ ان کی عزّت، اُن کے ادبی کارناموں کی وجہ سے کرتے تھے۔ جو ان کے نزدیک تھے۔ وہ اُن کے ادبی کارناموں کے علاوہ

ذاتی حیثیت میں بھی ان کی تعظیم کرتے تھے۔ وہ ایسے محسن تھے کہ سب کے محسن تھے۔

معلوم ہوا کہ سیّد صاحب کے بچپن کے مشاغل میں، اناؤ سے امیرالدولہ لائبریری (لکھنؤ) میں ہر ہفتہ جانا، وہاں سے انگریزی کتابوں کا لانا، پھر انھیں حرف بہ حرف پڑھنا، اُن کے نوٹس لینا یا پھر انگریزی فلمیں دیکھنا تھا۔ فلم بینی میں ان کے ہمراہ علی عباس حسینی ہوتے تھے۔ یہ دونوں اتنی باقاعدگی سے فلمیں دیکھتے تھے کہ رمضان شریف کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ روزہ اپنی جگہ، فلم اپنی جگہ!

یہ جس سکول میں پڑھتے تھے۔ اُن کے ہیڈ ماسٹر تھے سر جُو نرائن تیواری، وہ پریم چند کے عزیز تھے۔ وہ کلاس میں پریم چند کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ذکر سے شوق اُبھرا۔ اُنھوں نے پریم چند کو پڑھا۔ پھر سیّد صاحب نے پریم چند کی تقلید میں چند افسانے بھی لکھے۔ ادب بچپن ہی میں گھٹی میں پڑ گیا۔

وقار صاحب نشانہ بازی میں بھی ماہر تھے۔ گھر میں چھوٹے پیسے کو زمین پر رکھ کر یا سامنے دیوار میں اٹکا کر چھرے والی بندوق سے ایسی نشانہ بازی کرتے کہ نشانہ چوکتا نہ تھا۔ نشانہ نہ تو بچپن میں خطا ہوا اور نہ زندگی کی دھوپ میں، ہر مشکل کو آسان بنانا ان کا خاصا رہا۔

یہ شہسواری میں بھی ماہر تھے۔ گھر میں ایک عربی نسل کا گھوڑا تھا۔ اس پر سوار ہو کر میلوں میل نکل جاتے تھے اور بے تکان گھومتے رہتے تھے۔ سیّد اقبال عظیم نے بتایا کہ مجھے یاد ہے کہ اناؤ سے سولہ سترہ میل کے فاصلے پر ایک مٹھائی والا تھا۔ اس کی مٹھائی مشہور تھی۔ ہم بھائی صاحب سے کہتے، آج مٹھائی کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ وہ کہتے ابھی لایا۔ گھوڑے پر سوار ہوتے۔ تھوڑی دیر کے بعد مٹھائی موجود

ہوتی۔ چینی کی مٹھائی بہن بھائیوں نے کھائی، ادب کی مٹھائی ہم سب کے حصّہ میں آئی۔

سیّد صاحب دیکھنے میں تو دھان پان تھے۔ مگر مضبوط تھے۔ انھیں غصّہ آتا نہ تھا۔ مگر ایک بار غصّہ آیا۔ ان کے ہاں ایک نوکر تھا، اچھا خاصا لحیم شحیم، وہ ان کے ہاں سے نوکری چھوڑ کے چلا گیا اور اس نے ان کے گھر کے آس پاس ہی دوسری جگہ نوکری کر لی۔ اُس نے ان کے والد کی شان میں گستاخی کی۔ یہ وہاں پہنچے، اُسے بلایا۔ جب وہ باہر آیا تو انھوں نے اُسے گھونسوں اور لاتوں سے خوب پیٹا۔ جن راہگیروں نے وہ تماشا دیکھا، وہ حیران کہ مقابلہ سیر اور چھٹانک میں تھا۔

سیّد صاحب کا بچپن، عجیب بچپن تھا۔ سیّد اقبال عظیم کہتے ہیں کہ میرا اور بھائی وقار صاحب کی عمر میں صرف دو سال کا فرق تھا۔ یہ فرق کوئی خاص فرق نہ تھا۔ مگر اُن سے بے تکلف نہ ہو سکا۔ وہ ہمیشہ بزرگ بنے رہے۔

ان کے والد پولیس میں تھے، اچھے خاصے بڑے عہدے پر، ان کے لیے پولیس کی نوکری ایک معمولی بات تھی۔ مگر نہ یہ اس کے لیے راضی ہوئے اور نہ ان کے والد، یہ سول سروس کے امتحان میں بھی بیٹھے مگر اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اگر ایک اور آسامی پُر کر دی جاتی تو یہ بھی منتخب ہو جاتے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا انھیں اس کرسی سے بھی اونچی کرسی پہ بٹھانا مقصود تھا۔

وقار صاحب کی شادی علی گڑھ میں ہوئی۔ تعلقات غلام السیدین سے بڑھے۔ ان کے اصرار پر بی۔ ٹی کا امتحان پاس کیا۔ وہی انھیں جامعہ ملیّہ لے گئے۔

ان کی زندگی میں جو اہم موڑ آیا۔ وہ جامعہ ملیّہ کی ملازمت کا تھا۔ جامعہ نے

ان کے کردار کی تشکیل میں بڑا نمایاں رول ادا کیا۔ وہاں کا ماحول ایثار و قربانی کا ماحول تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، معمولی معمولی تنخواہوں پر کام کرتے تھے۔ حالانکہ جامعہ سے باہر ان کے لیے بڑی بڑی نوکریاں دامن پھیلائے ہوئے تھیں۔ جب سید صاحب بھی اسی رنگ میں رنگے گئے تو کندن بن گئے۔ دنیا کی بڑائیاں جھولی میں پڑ گئیں۔

پروفیسر اقبال عظیم، سید وقار عظیم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ شکل و صورت میں مشابہت ہے۔ کبھی کبھی کے دیکھنے والوں کو مغالطہ بھی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ انھوں نے بھی۔ شعر وہ بھی کہتے تھے، شعر یہ بھی کہتے تھے۔ ترنّم بھی دونوں کا خوب تھا۔ لوگ جھوم جھوم اُٹھتے تھے۔ البتہ وقار صاحب نے ابتدا میں تو شعر و شاعری کی۔ بعد میں ترک کر دی۔ لہٰذا ترنّم بھی رخصت!

کچھ عرصے سے پروفیسر اقبال عظیم صاحب کی بینائی جاتی رہی ہے۔ اب وہ بغیر سہارے اور رہنما کے گھوم پھر نہیں سکتے۔ ایک دن اقبال عظیم صاحب اپنے ایک دوست کے ہمراہ انارکلی سے گزر رہے تھے کہ کسی نے اقبال عظیم کو دُور سے سلام کیا۔

ساتھی نے کہا: "ایک صاحب نے آپ کو سلام کیا ہے۔"

اقبال عظیم صاحب کا جواب یہ تھا: "انھوں نے مجھے بھائی صاحب کے مغالطے میں سلام کیا ہے۔ اگر وہ اقبال عظیم کو سلام کرتے تو انھیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ مجھے تو دکھائی نہیں دیتا۔"

ہاں تو میں نے عرض کیا کہ دونوں بھائیوں میں بڑی مشابہتیں ہیں۔ جسم بھی ویسا

چھریرا، قد بوٹ بھی اِتنا، رنگت بھی وہی گیہواں، یہی وجہ ہے کہ اب کے جو میں اقبال عظیم کو وقار صاحب کے گھر ملا تو اقبال عظیم نے کہا "یہاں آتا ہوں تو یادیں گھیراؤ کرتی ہیں بھائی صاحب کی ایک ایک بات یاد آتی ہے۔ تڑپاتی ہے۔ اب دیکھ لو نا، یہ جو میں نے شیروانی پہن رکھی ہے، بھائی صاحب کی ہے"۔

وقار صاحب بڑے حوصلے والے انسان تھے۔ والد صاحب کا انتقال ہوا، والدہ کا انتقال ہوا، تین بہنوں کا انتقال ہوا، دو بھائیوں کا انتقال ہوا۔ مگر یہ روئے نہیں سب کی ڈھارس بندھاتے رہے۔

یہ زندگی میں کبھی بھی نروس نہیں ہوئے۔ بڑے سے بڑے پہاڑ کو بھی، اُنھوں نے سر پہ ایسے رکھ لیا، جیسے وہ پہاڑ نہ ہو بلکہ ایک چھوٹا سا پتھر ہو۔

البتہ انھیں دو مواقع پر افسردہ دیکھا گیا۔ ایک موقع وہ تھا کہ جب اُنھیں ۱۹۳۴ء میں بطور لیکچرار منتخب نہ کیا گیا۔ اس کمیٹی کے صدر مسعود حسن رضوی تھے۔ اُنھوں نے یقین دلا رکھا تھا کہ آپ کا حق ہے اس لیے آپ ضرور منتخب ہوں گے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مخالفت صرف مسعود حسن رضوی نے کی تھی۔ سیّد صاحب کہا کرتے تھے کہ میرا منتخب نہ ہونا اتنا بڑا دھچکا نہ تھا، جتنا یہ کہ انسانیت پر سے اعتماد اُٹھ گیا۔

دوسری مرتبہ افسردہ انھیں اس وقت دیکھا گیا کہ جب اورئینٹل کالج لاہور میں ریڈر کی آسامی خالی تھی۔ اس کے اُمیدوار دو تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سیّد وقار عظیم۔

جب پہلے پہل وقار صاحب نے لیکچرر شپ کے لیے کوشش کی تھی تو اس وقت وقار صاحب کی بجائے سیّد احتشام حسین منتخب ہو گئے تھے۔ اس بار احتشام صاحب

منتخب کرنے والی کمیٹی کے رکن تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس دفعہ بھی وقار صاحب منتخب نہ ہو سکے۔

بہرحال انھوں نے اس دھچکے کو بھی برداشت کیا۔ اس کے بعد بہت تیزی سے ادبی کاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اپنے آپ کو خوب مصروف رکھا۔ جیسے کسی نے نئے سرے سے عزائم کو مہمیز لگا دی ہو۔

وقار صاحب کے والد بھی شعر کہتے تھے۔ عرشؔ تخلص کرتے تھے۔ پورا نام سیّد مقبول عظیم عرشؔ! وہ صرف نعت کہتے تھے۔ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا عبدالباری آسیؔ، قدیر لکھنوی وغیرہ کے ساتھ تھا۔

اقبال عظیم کہتے ہیں کہ بھائی صاحب کو میری غزلیہ شاعری سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ کہا کرتے تھے "عشق و عاشقی کی شاعری چھوڑو، اسمٰعیل میرٹھی کی طرح بچّوں کے لیے نظمیں لکھو۔ یہ کیا تم بے مقصد شاعری کرتے ہو۔ ہجر و وصال کے افسانے تراشتے ہو۔"

ایک واقعہ یہ بھی سنایا کہ جن دنوں "آج کل" کے مدیر آغا دا داشی تھے۔ میں نے اُن دنوں ایک غزل "آج کل" کے لیے بھیجی۔ وہ چھپ گئی۔ کچھ لوگوں کو غزل پسند آگئی۔ بعد میں جب بھائی صاحب "آج کل" کے مدیر ہوئے۔ اُن دنوں انھیں ایک خط ملا۔ اقبال عظیم کی بھی غزلیں چھاپیں۔

اُدھر بھائی صاحب مجھے نصیحتیں کیا کرتے تھے کہ غزلیں وزلیں نہ کہا کرو۔ اِدھر بھائی صاحب بحیثیت مدیر اپنے اُوپر کچھ ذمہ داریاں محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اس فرمائش والے خط کے ساتھ، مجھے ایک خط لکھا۔ "محترم! تسلیم! ۔ منسلکہ خط ارسال ہے۔ چند غزلیں عنایت فرمائیں۔"

یہاں جو بات عرض کرنے والی ہے وہ یہ کہ اپنی ایک رائے کے باوجود اپنے فرائض سے کوتاہی نہ کی۔ پھر بھائی پندار کو بیچ میں نہ لائے۔ بس ایک رکھ رکھاؤ کے ساتھ خط لکھ دیا۔

اقبال عظیم کہتے ہیں کہ ایک طرف تو اُن کی، میری شاعری پر جو رائے تھی، آپ نے سُن لی۔ دوسری طرف وہ میرے اچھے اشعار کو ذہن میں محفوظ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ جب میرا مجموعہ کلام چھپنے لگا تو میں نے اُن سے فرمائش کی کہ دیباچہ لکھ دیجیے۔ ابھی میں اُن کی طرف سے جواب کا منتظر ہی تھا کہ دیباچہ لکھا ہوا پہنچ گیا۔ اس دیباچہ میں میرے متعدد اشعار نوٹ کیے ہوئے تھے۔ جب کہ اُن کے پاس میرا مسودہ نہ تھا۔

سیّد وقار عظیم نے زیادہ تر کام، اُردو افسانہ پر کیا، داستانوں پر کیا۔ موضوع اپنے لیے مختص کر لیا۔ ہر چند کہ اُنھوں نے دیگر موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں۔ حق بھی ادا کیا مگر داستانوں اور اُردو افسانہ پر تو ان کی تحریریں اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

نثر نویسی میں یہ بڑا ٹیڑھا کام تھا۔ آج زیادہ تر نقّاد شاعری کے ملتے ہیں۔ ہر کسی کے لیے شاعری کا پڑھنا، اس سے حظ اُٹھانا، روز مرّہ کا شغل ٹھہرا۔ مگر داستانوں کا پڑھنا، فنّی اور تنقیدی نظر سے پڑھنا، شغل نہیں جان جوکھوں کا کام ہے۔ انھوں نے اپنی قلمی ریاضت کے سلسلے میں آسان راہ کی طرف دھیان نہ دیا، مشکل راہ اختیار کی۔ اگر ناقدین میں مولانا صلاح الدین احمد اور سیّد وقار عظیم اُردو افسانہ کو نہ ملتے تو آج اُردو افسانہ اتنا ترقی یافتہ بھی نہ ہوتا۔

اختصاص کی وجہ شاید یہ ہو کہ بچپن میں اُن کے جو اُستاد تھے وہ پریم چند کے رشتہ دار تھے اور پریم چند اُس زمانے میں اُردو افسانے کا خدا تھا۔ یہ رشتہ استوار ہوتے

ہوتے زندگی کا مسلک بن گیا۔

میرا یہ مضمون خاکہ نگاری کی روش سے زیادہ سوانح نگاری کی طرف جُھک رہا ہے۔ میں اسے اس مخمصے سے نکالتا ہوں۔ آدمی یا تو سراسر کافر ہو یا سراسر مسلمان!

وقار صاحب کی زندگی ایک مقررہ ڈھرے پہ چلتی رہی۔ اس میں کوئی اُتار چڑھاؤ نہ تھا۔ کوئی مدّوجزر نہ تھا۔ ایک پُرسکون زندگی، ایک بااصول زندگی، وہ ہنگاموں سے دُور بھاگتے تھے۔ اگر کسی ہنگامے نے ان کی دہلیز پہ دستک دے ہی ڈالی تو اُنھوں نے اس ہنگامے کو اپنے تدبر سے فرو کر لیا یا صبر کر لیا مقابلے میں نہ اُترے۔

غرض وقار صاحب کا، زندگی گزارنے کا ایک ضابطہ تھا۔ پروگرام پہلے سے بن جاتا تھا کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک یہ کام کرنا ہے اور فلاں وقت سے فلاں وقت تک یہ کام، یوں ہفتوں اور مہینوں کے پروگرام بن جایا کرتے تھے۔ پھر اُن پہ عمل ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی سلیقہ مندی سے، بہت سارے بلکہ سارے کے سارے کام کیے۔

یہی وجہ ہے کہ قلم کی روزی سے اُنھوں نے اپنا ایک اچھا سا گھر بنایا۔ جُملہ آسائشوں والا گھر، ایک اچھی سی موٹر خریدی، پھر پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ بلکہ شان کے ساتھ زندگی گزاری۔

میں نے اُن میں ایک خاص بات دیکھی۔ وہ یہ کہ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتے تھے۔ اُنھوں نے کبھی کسی دوست سے اُدھار نہ مانگا۔ آج تو ماشاءاللہ ان کے بچّے جوان ہیں، اچھی نوکریوں پہ ہیں۔ مگر میں اُن دنوں کی بات کر رہا ہوں کہ جب بچّے چھوٹے تھے۔

ان کی طبیعت کا ایک خاصہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ اپنے تالیف و ترجمہ کے دفتر میں گئے۔ سٹاف کو بلا کر کہا۔ "یوں سمجھیں کہ ہم سب ایک خاندان کے لوگ ہیں۔ ہمیں اکٹھا رہنا ہے اور اس خاندان کو باوقار مقام تک پہنچانا ہے۔ لہٰذا میں بھی محنت کروں گا، آپ بھی محنت کریں۔"

اگر سٹاف کا کوئی آدمی بیمار ہو گیا تو اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر پہنچے۔ اگر سٹاف کے کسی رُکن کا انتقال ہو گیا تو تعزیت کے لیے پہنچے۔ غرض اُن کا اپنے سٹاف کے ساتھ وہی برتاؤ تھا جو گھر کے ایک بزرگ کا اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔

وقار صاحب کے بارے میں کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے؟ وہ بہت صلح جُو شخصیّت کے مالک تھے۔ دوستوں کو ایک دُوسرے کے قریب لانا اُن کا مشن تھا۔ میں نے اُن کی زبان سے کم کسی کی بُرائی سُنی ہو گی۔ وہ کہا کرتے تھے۔ کیوں دوسروں کی بُرائیاں کریں۔ کیوں اپنا خون کھولائیں!

میں لقمہ دیتا۔ "وقار صاحب! زندگی کو اتنا زیادہ بے رونق بھی تو نہیں بنانا چاہیے۔"

وہ مجھے سمجھاتے۔ "دوسروں کے منہ لگنے سے بہتر ہے کہ وقت کو اپنی زندگی سنوارنے میں صرف کیا جائے۔ بیوی بچّوں کے معاملات میں دلچسپی لی جائے اور لکھنے پڑھنے میں حجلہ راحتوں کو ڈھونڈا جائے۔"

میں عمر میں اُن سے چھوٹا تھا۔ اس لیے کئی معاملات میں تندی و تیزی کا مظاہر

بھی کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے کہتے "نہ نہ ایسا نہ کرو۔ جذبات سے نہ کھیلو۔ بلکہ اِس محاورے پر عمل کرو۔ ایک چُپ سو سُکھ!"

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اب جاکر جو مجھ میں تھوڑی سی نرمی آئی ہے وہ صرف سیّد وقار عظیم کی نیاز مندی کی وجہ سے!

وقار صاحب نے ایک خاص طرز کا لباس پہنا، پھر زندگی بھر وہی لباس پہنا، پاجامہ کُرتا اور شیروانی، یہ اُن کے تن کا لباس تھا۔ ہاں مولانا حالی کی طرح، ان کے کندھوں پہ مفلر بھی ہوتا تھا۔ وہ بھی ان کے لباس کا ضروری حصّہ تھا۔

تن کے لباس کا ذکر آپ نے سُن لیا۔ من کے لباس کا ذکر بھی آپ کے سامنے مختلف حوالوں سے آیا۔ انھوں نے ہمیشہ صاف سُتھرے کپڑے پہنے، مگر اُن کا من، اُن کے تن کے کپڑوں سے زیادہ اُجلا تھا۔

جن لوگوں کو سوسائٹی میں عروج حاصل ہوتا ہے یا جن کی شہرت کو پَر لگ جاتے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ باور کراتے ہیں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔ اُن میں اس قسم کی تفاخرانہ بات کوئی نہ تھی۔ بلکہ جُوں جُوں انھیں دوستوں کی محبّت حاصل ہوتی گئی یا دُنیاوی اعتبار سے اہمیت بڑھتی گئی۔ اُن میں عاجزی آتی چلی گئی۔ وہ کہا کرتے تھے۔ پھل دار درخت ہمیشہ جُھکا ہوا ہوتا ہے۔

میں نے اُن کے اس فقرے پر کہ پھل دار درخت ہمیشہ جُھکا ہوا ہوتا ہے۔ عرض کیا تھا "پھل دار درخت بے شک جھکا ہوا ہوتا ہے۔ مگر سارے پھل میٹھے تو نہیں ہوتے"

اس پر اُنھوں نے کہا تھا "نظامِ قدرت کے اصول تو اٹل ہیں۔ ساری گڑ بڑ

برداشت کی ہے۔ یہی حال انسان کے بننے اور بگڑنے کا ہے"۔

ہاں تو میں بات کر رہا تھا۔ اُن کی نرم روئی اور عاجزانہ روش کی، دوستوں کے دلوں میں گھر کرنے کا، اُن کا ایک رویہ یہ بھی تھا کہ بہانے بہانے سے دوستوں کی دعوتیں کیا کرتے تھے۔ پھر بڑی بڑی دعوتیں، ورنہ جو لوگ ذرا اُوپر اُٹھ جاتے ہیں وہ دوسروں کے ہاں دعوتوں میں حاضر ہونے کو ہی، میزبان پر احسان دھرنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ یعنی آج بڑے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ دعوتیں کھاتا ہو۔ کھلاتا نہ ہو۔

آج کل دوستیاں جیتے جی کی ہیں۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جو زندگی میں بہت ہی قریب ہوتے ہیں وہ دوست کے جنازے تک میں شریک نہیں ہوتے۔ سوچتے ہیں، جس سے میل جول تھا۔ جب وہ چل دیا۔ پھر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔

مگر وقار صاحب کی ادائیں اوروں سے مختلف تھیں۔ ہمارے ایک مشترکہ دوست کا انتقال ہو گیا۔ کبھی اُس دوست کے اچھے دن تھے۔ اس کے دستر خوان پر متعدد لوگ سیر ہو کر اُٹھتے تھے مگر گردشِ زمانہ کا کیا علاج!

ہم سب اپنے دوست کے انتقال پر بے حد رنجیدہ تھے مگر عملاً کچھ نہیں کر رہے تھے۔ اس دوران عید آ گئی۔ وقار صاحب کا ٹیلی فون آیا "بھئی عید آ رہی ہے اپنے دوست کے بچّوں کا بھی کچھ خیال ہے؟"

میں نے کھسیانا ہو کر کہا "جی ہاں، جی ہاں!"

کہنے لگے "میں نے قریبی دوستوں سے، مرحوم کے بچّوں کے لیے کچھ رقم اکٹھی کی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ بھی اپنا حصّہ ڈال دیں"۔

چنانچہ وقار صاحب جب تک زندہ رہے وہ ہر عید پر، کوئی ہفتہ بھر پہلے،

مرحوم دوست کے گھر پہنچا کرتے تھے اور مرحوم کے بچوّں کو کچھ نہ کچھ دے آتے تھے۔

آج وقار صاحب کے انتقال کو دو برس ہو گئے ہیں۔ دو برس میں میرے پاس کوئی بھی نہیں آیا جس نے کہا ہو کہ عید آرہی ہے۔

جی ہاں! سیّد صاحب دوستوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ یہ رویّہ ان کا اپنے سے چھوٹوں سے ہوتا۔ وہ دوستوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہ رویّہ ان کا بڑوں سے ہوتا۔ حفظِ مراتب کے جتنے وہ دلدادہ تھے، کم کوئی ہوگا۔ غرض وہ چھوٹوں کے خیر خواہ اور بڑوں کے نیازمند تھے۔

میں نے ہمیشہ اُن کی زبان سے جسٹس ایس۔ اے رحمان، پروفیسر حمید احمد خاں، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے لیے تحسین کے کلمات ہی سُنے۔ حالانکہ وہ ان کے سامنے نہ ہوتے مگر ان کی صفات ان کے ہر دم سامنے رہتی تھیں۔

بدقسمتی سے پنجاب یونیورسٹی میں، ہندوستان سے ہجرت کرکے آنے والے دوستوں اور پنجابیوں کے درمیان ایک دُوری دُوری کی سی فضا قائم ہے۔ مگر سیّد صاحب ایک ایسی متوازن شخصیت کے مالک تھے کہ ان جھمیلوں میں کم ہی اُلجھتے تھے۔ اُنھوں نے انسانیت جہاں دیکھی، اُسے سینے سے لگا لیا۔

تالیف و ترجمہ کے دفتر میں ٹیلیفون نہ تھا۔ اُنھوں نے ٹیلی فون کے لیے درخواست دی۔ فنانس کمیٹی نے درخواست نامنظور کردی۔ کمیٹی کے ریمارکس یہ تھے۔ ٹیلی فون بیجا فضول خرچی کی مد میں آتا ہے۔ پھر اسی مسئلے پر غور کے لیے ایک میٹنگ ہوئی۔

اس میٹنگ میں آدابِ میزبانی کے طور پر فنانس کمیٹی نے چائے اور بسکٹ کا انتظام کیا۔ وقار صاحب نے کہا "اگر ٹیلی فون فضول خرچی کی مد میں آتا ہے تو یہ چائے اور

لبسکٹ بھی فضول خرچی کی مد میں آتے ہیں۔ لہٰذا میں اس میٹنگ میں رہ بیٹھوں گا کہ جو خود اپنے فیصلوں پر عمل نہیں کرتی۔"

اس کے بعد اُنھوں نے فنانس کمیٹی سے، ٹیلی فون کے سلسلے میں قطعاً کوئی رابطہ نہ رکھا۔ مگر سنڈیکیٹ کو درخواست دے کر ٹیلی فون لگوا لیا۔

حمید احمد خان سے وقار صاحب کا بڑا یارانہ تھا مگر حمید احمد خان بھی اصول کے آدمی تھے۔ اس معاملے میں دوست دشمن سب برابر تھے۔

ایک موقع ایسا آیا کہ حمید احمد خان، وقار صاحب کو فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ چونکہ معاملہ اُصول کا تھا۔ اس لیے حمید احمد خان نے فیصلہ وقار صاحب کے مدِمقابل کے حق میں کر دیا۔

وقار صاحب کو اس کا رنج بھی ہوا ہوگا۔ مگر معاملہ اصول کا تھا۔ اس لیے شکوہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اُدھر حمید احمد خان کو یہ خیال تھا کہ دوستی میں رخنہ نہ پڑے اُنھوں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں غالب چیئر کی ایک نئی جگہ نکالی اور وہاں وقار صاحب کا تقرر کر دیا۔ یوں وقار میں بھی اضافہ ہوا۔ دوست بھی خوش ہوگیا۔ اُصول بھی نہ ٹوٹا۔

انہی دنوں کئی لوگوں نے وقار صاحب کو چھیڑا۔ "حمید احمد خان نے آپ کا مطلق خیال نہیں رکھا۔" وقار صاحب کا جواب یہ تھا "میرا ہی حق نہ ہوگا۔"

یہ وقار صاحب کی شفقت تھی کہ وہ میری باتوں کو غور سے سنتے تھے مشورے دیتے تھے۔ کبھی میں نے کسی معاملے میں ضد کی تو اس کا بھرم بھی رکھ لیا۔

کچھ ایسے ہی امتحان کا ایک وقت وہ تھا کہ جب میں نے وقار صاحب سے جا کر یہ کہا "اس فارم پر دستخط کر دیجیے۔" وہ فارم رائٹرز گلڈ کے سلسلے میں رضامندی

کا تھا کہ الیکشن لڑوں گا۔

فارم کو میرے ہاتھ سے لے لیا۔ کہنے لگے "نہ آپ مجھ سے یہ فارم پُر کرائیں اور نہ آپ خود الیکشن لڑیں۔ ہمیں صرف اپنے ادبی کاموں سے دلچسپی رکھنی چاہیے"

میں نے ضد کی "اس ادارے کو مزید سنوارنا چاہیے"۔

وقار صاحب نے پھر سمجھایا "طفیل جانے دو۔ جانے دو!"

میں نے اصرار جاری رکھا "نہیں جناب! دستخط کیجیے۔ دستخط کیجیے"۔

چنانچہ اُنھوں نے بادلِ ناخواستہ فارم پر دستخط کر دیے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر بعض معاملات میں دلچسپی نہیں لینا چاہتے تھے لیکن دوستوں کے اصرار پر، صرف اُن کی خوشی کی خاطر، راضی بھی ہو جایا کرتے تھے۔

وقار صاحب یونیورسٹی سے فارغ ہو کر کبھی کبھی میرے دفتر بھی آن نکلتے تھے۔ پھر ہم بہت سی باتیں کیا کرتے تھے۔ کچھ ادبی کچھ ذاتی، ان کی فرمائش عموماً یہ ہوتی تھی۔ نوکر کو بھیج کر پان منگوا دیجیے۔ فلاں پھل والے سے پھل منگوا دیجیے۔ اگر میں کبھی ان چیزوں کے پیسے دیتا تو خفا ہوتے، کہتے یہ میری روزانہ کی ضرورتیں ہیں۔ دوست زیر بار کیوں ہوں!

اگر میں ان سے عرض کرتا "چائے پیجیے"۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا "ابھی گھر جا کے کھانا کھاؤں گا۔ چائے پی لی تو بھوک جاتی رہے گی"۔

ایک دن تشریف لائے تو بیٹھتے ہی کہنے لگے "بھئی طفیل چائے منگواؤ"۔

میرے لیے ان کی فرمائش خوشگوار حیرت کی بات تھی۔ جب نوکر چائے لانے کے لیے جا رہا تھا تو اس سے کہا "کچھ ساتھ کھانے کے لیے بھی لانا۔ آج میں گھر دیر

سے پہنچوں گا۔ کیونکہ ادھر یونیورسٹی میں ایک ضروری میٹنگ ہے"۔

چائے آئی۔ میں نے بنائی۔ ابھی ہم نے دو تین گھونٹ ہی پیئے ہوں گے کہ میں ایکدم بیہوش ہو گیا۔ ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ چائے میز پر تیر گئی اور میں ایک طرف کو لڑھک گیا۔

بعد میں میرے عزیزوں نے بتایا کہ جب آپ گرنے لگے تو وقار صاحب نے آپ کو سہارا دے کر گرنے سے بچایا۔ پھر فوراً اپنے ایک دوست ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا۔ ڈاکٹر کے ہاں پہنچایا۔ یوں اُس ضروری کام کا وقت بھی نکل گیا جس کے لیے وہ رُکنا چاہتے تھے۔ پھر میں جتنے دن ہسپتال رہا، وقار صاحب کا اصرار رہا۔ کھانا میرے گھر سے آئے گا۔

رائٹرز گلڈ میں وقار صاحب کی حیثیت، بنیادی قسم کی تھی۔ اُن کے تدبّر سے بڑے بڑے عقدے حل ہو جایا کرتے تھے۔ اوّل تو معاملے کی تہہ تک پہنچ کر، بات ہی اس انداز سے کرتے تھے کہ مخالفین کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی اور اگر کوئی دوست خلافِ ضابطہ، محض ضد کی بنا پر اڑتا تھا تو پھر اُن کا "برہمی نما خلوص" دیکھنے والا ہوتا تھا۔ ایسے عالم میں پھر کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ خلوص کے پہاڑ سے ٹکر لے۔

یوں تو سیّد صاحب نے جس ادارے میں بھی کام کیا۔ وہ یقیناً اُن کی روپوشی کی وجہ سے خاصے پریشان ہوں گے مگر وہ جو راہنما اصول چھوڑ گئے ہیں اُن کی بنیادوں پر مسئلے سُلجھتے ہی رہیں گے۔

عرض کر چکا ہوں کہ ایک تو وقار صاحب کا بات کرنے کا انداز ہی اپنے اندر

ایک سلیقہ اور ایک کشش رکھتا تھا۔ اس پر اُن کی مفرح ٹائپ گفتگو ہر درجہ لُطف دیتی تھی۔ اُن کے پاس گھنٹوں بیٹھے اُکتانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

گفتگو میں علمی انداز بھی تھا۔ مجلسی انداز بھی، اپنے اساتذہ کی بھی باتیں کرتے تھے۔ اپنے پرانے دوستوں کو بھی یاد کرتے تھے۔ یوں وہ حکمت آمیز باتوں سے آپ کو مالا مال کرتے تھے۔ اُن کے پاس خالی دامن جانے والے بھی خالی دامن نہیں لوٹا کرتے تھے۔

ابھی میں نے اُن کی شگفتہ مزاجی کی بات کی ہے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ سُن لیجیے۔ کوئی پچیس برس پہلے کی بات ہے کہ وقار صاحب نے ایک موٹر خریدی تھی پھر اُس موٹر کی شہرت یہ سُنی کہ وہ اپنی مرضی سے چلتی تھی اور اکثر نہیں چلتی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "وقار صاحب، یہ موٹر جس کی اتنی شہرت ہے۔ آپ نے کتنے میں خریدی؟"

کہنے لگے "سترہ سو روپے میں۔"

میں نے کہا "خُوب خریدی۔"

کہنے لگے "کالج آنے میں دقّت ہوتی تھی۔ اس مجبوری سے خریدی۔ مگر جب سے خریدی ہے کالج میں پہنچنا اور بھی غیر یقینی ہو گیا ہے۔"

ایک دن سُنا کہ وقار صاحب نے موٹر بیچ دی۔ وقار صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا "موٹر بیچ دی؟"

کہنے لگے "ہاں آٹھ سو روپے منافع میں!"

میں بہت خوش ہوا۔ پوچھا "پچیس سو میں؟"

کہنے لگے "اس موٹر کو تو کوئی مفت بھی لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ جو آٹھ سو ملے ہیں میں اُسے منافع سمجھتا ہوں"۔

وہ زندگی کے آخری دنوں تک کام کرتے رہے۔ انھوں نے زندگی کا ایک لمحہ تک ضائع نہیں کیا۔ انھوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ زندگی کا ہر لمحہ، دوسروں کی امانت ہے۔ وہ جتنے دن بھی ہمارے درمیان رہے امانتیں ہی لوٹاتے رہے۔

اگر انھیں ایک سو دو درجے کا بخار ہے اور اُن کی کہیں ضرورت ہے تو انھوں نے اپنی علالت کی پروا نہیں کی۔ وہ اس جگہ پہنچے۔ اپنے فرائض ادا کیے۔ جب جملہ مراحل طے پا جاتے تب وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر کہتے "ذرا ہاتھ لگائیے، مجھے اس وقت ۱۰۲ درجے کا بخار ہے"۔

وہ ہر وقت کام، ہر وقت کام کے اصول پر زندگی بھر عمل کرتے رہے۔ گرمیوں کی ایک دوپہر میں میرے پاس تشریف لائے۔ اتنے میں اچانک بجلی غائب ہو گئی۔ میں نے کہا "گرمیوں میں بجلی چلی جائے تو آدمی کسی کام کا نہیں رہتا"۔

فرمانے لگے "کیوں کام کا نہیں رہتا؟ میں تو ایسے مواقع پر، اپنی قمیص اُتار دیتا ہوں اور کام کرتا رہتا ہوں۔ ایسی لگن اور اپنے مقاصد سے اتنا خلوص، میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔

سید وقار عظیم مجھ سے دُور چلے گئے ہیں اور میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگا ہوں۔ وہ دُور ہو کر میرے بہت قریب ہیں۔ کیوں کہ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آج میرے مہربان دوستوں میں ایسا کوئی نہیں جس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر سکوں۔

جب میں نے سیّد صاحب کے انتقال کی خبر سُنی تو اُن دنوں میں کراچی میں تھا۔ رائٹرز گلڈ کے ایک جلسے میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ مجھے ایک مرکزی رکن نے ٹیلی فون کیا اور پوچھا۔ "آج کا اخبار پڑھا ؟"

میرا جواب یہ تھا کہ "جب میں لاہور سے باہر نکلتا ہوں تو اخبار نہیں پڑھتا کہ مبادا کوئی نیا صدمہ پہنچے"۔

میرے دوست نے کہا۔" اچھا تو پھر سنو۔ سیّد وقار عظیم کا انتقال ہو گیا ہے"۔

میں سناٹے میں آ گیا۔ اپنے سارے کام چھوڑ کر اُسی دن لاہور کے لیے چل دیا۔ مگر میں پھر وقار صاحب کو نہ دیکھ سکا۔ وہ میرے خیر خواہ تھے۔ وہ میرے بھائی تھے۔ وہ میرے محسن تھے۔ میں کیا کیا کچھ بتاؤں ؟

ایسے لوگ جن کے کارنامے موجود اور زندہ ہوں۔ وہ مر نہیں سکتے۔ روپوش ہو سکتے ہیں۔ مرتے وہ لوگ ہیں جو دنیا میں محض اپنے لیے آتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں وہ نہیں مرا کرتے !

مجھے اس موقع پر بھگت کبیر کا ایک دوہا یاد آ گیا ہے وہ سُن لیجیے ۔

کہت کبیر سُن ری میری لوئی
ہم نے نہیں مرنا روئے نہ کوئی

شیخ صاحب

شیخ صاحب سے مراد، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، جو مہربان دوست تھے مگر دُور چلے گئے۔ اللہ میاں کے پیاروں میں شامل ہو گئے۔ آخر اللہ کو اتنے پیاروں کی کیا ضرورت ہے؟ یہ عُقدہ آج تک نہ کھُلا۔

عام لوگوں کی زندگی میں اور ادیبوں کی زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ عام لوگ اپنی طبعی عمر کے بعد مر ہی جاتے ہیں مگر ادیب کی زندگی کا آغاز، اُس کی موت کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے شیخ صاحب کتنے برس تک زندہ رہیں گے۔ میں کوئی پیش گوئی نہیں کرتا۔ میں تو صرف ان کے بارے میں باتیں کروں گا۔

شیخ صاحب کا قد چھوٹا تھا۔ جسم بھی قدرے اکہرا، آنکھیں بڑی بڑی، چہرے پہ سفید داڑھی، سر پہ ترکی ٹوپی، باتیں تیزی سے کرتے تھے۔ بس فُر فُر کی آواز آتی تھی اور کچھ پلّے نہ پڑتا تھا۔ ابتدا میں تو مَیں بھی بڑا پریشان ہوا۔ بعد میں جملہ باتیں سمجھ لیتا تھا۔

ایک دن شیخ صاحب تشریف لائے۔ ہم کسی معاملے میں مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے شیخ صاحب سے پوچھا۔ "پھر آپ نے کیا سوچا؟"

شیخ صاحب میرے سوال پر گھبرائے۔ ایک طرف سرک کر، اور ان صاحب کی طرف خفیہ اشارہ کرکے اور ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا مشورہ دیا۔

میں نے دوبارہ کہا: "بتا دیجیے۔ کچھ فرق نہ پڑے گا۔"

شیخ صاحب نے سوچا۔ طفیل غلطی کر رہا ہے۔ لہٰذا یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے: "میں ذرا لائبریری تک جا رہا ہوں۔ واپسی پر حاضر ہوں گا۔"

میں نے کہا: "بہت اچھا۔"

جب شیخ صاحب دوبارہ آئے تو کہنے لگے: "آپ عجیب آدمی ہیں۔ جن صاحب کے بارے میں آپ میری رائے پوچھ رہے تھے وہ تو موجود تھے اور اُن کی موجودگی میں مجھ سے رائے طلب کر رہے تھے۔"

میں نے جواب میں کہا: "میں نے سوچ لیا تھا کہ گفتگو محتاط انداز میں کروں گا اور آپ کی باتیں تو اُن کی سمجھ میں آنا ہی نہ تھیں۔ لہٰذا اُن کے سامنے گفتگو کرنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔"

میری اس رائے پر شیخ صاحب اس انداز سے ہنسے کہ متعلقہ صاحب اگر موجود بھی ہوتے تو معلوم نہ کر سکتے کہ شیخ صاحب میری سادگی پہ ہنسے یا اپنی گفتگو کے کمال پر!

شیخ صاحب عمر کے اس حصے میں تھے کہ جب آنکھیں جواب دے جاتی ہیں۔ مگر شیخ صاحب کی بینائی میں بڑی جان تھی۔ وہ بڑے خوش خط تھے۔ کتابت کے رموز سے بھی کماحقہٗ آگاہ تھے۔ بڑا باریک باریک لکھتے تھے۔ سطریں بالکل سیدھی جیسے کوئی فوجی کھڑا ہو۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "میں آپ کو چاول کا ایک دانہ دکھاتا ہوں"۔
میرا جواب یہ تھا "کیا آپ مجھ سے دیگ کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"
"نہیں نہیں ذرا رُکو تو، یہ کہہ کر اُٹھے اور ایک چھوٹی سی ڈبیا اُٹھا لائے۔
کہنے لگے "دیکھو!"
"کیا دیکھوں؟"
"کہ اس ڈبیا میں کیا ہے؟"
میں نے ڈبیا کھولی تو رُوئی کے اندر لپٹا ہوا چاول کا ایک دانہ پڑا تھا۔
میں نے کہا "یہ دانہ بڑا خوش قسمت ہے۔ اسے بڑے اہتمام سے رکھا گیا ہے
قصّہ کیا ہے؟"
کہنے لگے "چاول کے اس دانہ پر پوری قُل ہُو اللہ لکھی ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے
مجھے ایک چھوٹا سا محدب شیشہ دیا اور کہا کہ "پڑھ لو"۔
میں نے شیشے کی مدد سے چاول کو دیکھا تو اس پر بڑی مہارت سے پوری قُل ہُو اللہ
لکھی ہوئی تھی۔
میں نے سُن رکھا تھا کہ لوگ چاول کے دانے پر قُل ہُو اللہ اور چنے کے دانے پر
الحمد شریف لکھ لیتے ہیں مگر دیکھا کبھی نہ تھا۔ میں نے استفسار کیا "یہ کس نے لکھا ہے؟"
کہنے لگے "میں نے لکھا ہے اور آپ کی نذر ہے"۔
مجھے اُس دن معلوم ہوا کہ چاول کا دانہ بھی کتنی اہمیّت رکھتا ہے مگر میرا دھیان
دانۂ گندم کی طرف نکل گیا کہ جس کی سزا ہم آج تک بُھگت رہے ہیں۔
ہماری دوستی عجیب تھی۔ وہ بزرگ میں نوجوان (یہ قصّہ ۱۹۵۱ء کا ہے) وہ ساٹھ

کے پیٹے میں، میں نوجوانی کی دہلیز پر، وہ جیّد عالم، میں ادب کا طالب علم، وہ اخلاق کا مجسّمہ، میں تُند خو اور سرکش، وہ کٹّر مذہبی، میں ترقی پسند ادب کا دلدادہ۔ غرض کوئی بھی قدرِ مشترک نہ تھی۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک تھے۔ وہ گھریلو قسم کے مشورے بھی مجھ سے لیا کرتے تھے۔ مَیں جوانی کی ترنگ کی باتیں بھی اُن سے کرلیا کرتا تھا۔

ایک دن شیخ صاحب نے مجھ سے پوچھ ہی لیا "طفیل صاحب! یہ لڑکی آپ کے پاس بہت آتی ہے"؟

"جی!"

"آخر کیوں؟"

"اُس کی مرضی!"

غرض میرا اخلاق سنوارنے کی شیخ صاحب نے بڑی کوشش کی۔ اللہ ہی جانے کہ وہ کس حد تک کامیاب ہوئے۔ ویسے ایک کھٹک سی اور ایک کسک سینے میں آج بھی موجود ہے کہ جن دنوں میرا یارانہ سعادت حسن منٹو اور ممتاز مفتی کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اُن دنوں میں بڈھوں میں گھر گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عین جوانی میں بھی میری سوچیں بوڑھی ہوگئیں۔

اب جوانی کو یاد کرتا ہوں تو وہ چڑاتی ہے۔ ٹھینگا دکھاتی ہے۔ معلوم نہیں آپ کا اس بات پر یقین ہے کہ نہیں کہ ہر چیز بولتی ہے! یہ دیواریں، یہ درخت، یہ پھول سب بولتے ہیں۔ صرف سننے والے کان چاہییں۔

اگر آپ کے خیال میں یہ دیواریں، یہ درخت اور یہ پھول نہیں بولتے تو کیا آپ کو

اس بات سے بھی انکار ہے کہ جوانی بھی نہیں بولتی ؟

شیخ صاحب کا مجھ پر ایک ایسا احسان ہے جسے میں زندگی بھر بھلا نہ سکوں گا۔ قصہ نقوش کی ادارت کا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں سید وقار عظیم نے مجھے بتایا کہ اب میں نقوش کی ادارت نہ کر سکوں گا۔ کیوں کہ یونیورسٹی نے اس سال اجازت نہیں دی۔

ایک برس تک سید وقار عظیم نے نقوش کو سنوارا تھا۔ ڈیڑھ دو برس تک ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی نے، چنانچہ میں خاصا پریشان تھا۔ شوق کو سوسو وسوسے لاحق ہوئے مگر دل ایک لحاظ سے مطمئن بھی تھا کہ چلو خسارے سے تو جان چھوٹی !

ایسے ہی عالم میں شیخ صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ آنکھوں سے میرے چہرے کا حال پڑھا۔ پوچھا "خیر باشد ؟"

میرا جواب یہ تھا "خیر تو ہے مگر پریشان بہت ہوں"

"یہ کیا معمّہ ؟"

"خیر اس لیے ہے کہ نقوش کے بند ہونے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ پریشان اس لیے ہوں کہ ابھی اس شوق کو دفنانے کا ارادہ نہ تھا"

شیخ صاحب نے ڈھارس بندھائی، "فکر والی کوئی بات نہیں۔ کل اس موضوع پر باتیں ہوں گی"

دوسرے دن شیخ صاحب تشریف لائے۔ میں نے دل میں گمان یہ کیا کہ کہیں گے۔ خاکسار کی خدمات حاضر ہیں۔ مگر ان کا مشورہ یہ تھا "اب ادارتی فرائض خود سنبھالو"

میں اس مشورے پر سنّاٹے میں آگیا، سہم گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ایک پہاڑ کا بوجھ، میرے سر پہ رکھ دیا ہو۔ میں نے ہڑبڑا کر، بے اوسان ہو کر، اس منصب پر فائز ادیبوں پر نگاہ دوڑائی۔ رتن ناتھ سرشار، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، سر عبدالقادر، دیا نرائن نگم، نیاز فتحپوری، ایک سے ایک جنید، ایک سے ایک عبقری!

میں شیخ صاحب سے کہتا ہی رہا "یہ ممکن نہیں۔ یہ ممکن نہیں" مگر اُن کا اصرار بھی بڑھتا گیا۔ یہی حل ہے۔ یہی حل ہے۔ بالآخر اُنھوں نے مجھے قلم کی روزی پہ ڈال ہی دیا۔ وہ دن اور آج کا دن کہ قلم کی چکی پیس رہا ہوں۔ قلم کی اس چکی میں جان و مال کا زیاں تو ہے مگر سکون کی دولت بھی بہت ہے۔ ہم لُٹنے پر بھی اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتے ہیں۔

شیخ صاحب کی یادداشت اور حافظے کا بھی عجیب عالم ہے۔ کتابوں کے حوالے ازبر، عبارتیں ازبر۔ شیخ صاحب کسی دوسرے شہر جا رہے ہیں۔ سوٹ کیس ہاتھ میں ہے کہ ایک شخص راستے میں مل گیا۔ انھیں مولانا الطاف حسین حالی کی لائبریری سے کسی کتاب کی ضرورت تھی۔ اُس نے شیخ صاحب سے کہا "مجھے فلاں کتاب چاہیے"۔

شیخ صاحب نے جواب دیا "اب تو میں باہر جا رہا ہوں۔ واپسی پر سہی"۔

وہ صاحب لپٹ گئے۔ کہا "مجھے کتاب کی فوری ضرورت ہے"۔

اُنھوں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو خواجہ صاحب سے جا کر کہیں کہ فلاں الماری میں اور فلاں شیلف میں وہ کتاب پڑی ہے۔ وہ آپ کو دے دیں گے"۔

وہ شخص خواجہ سجاد حسین کے پاس پہنچا۔ اُس نے جا کر کہا "مجھے یہ کتاب چاہیے"

خواجہ صاحب نے فرمایا "وہ نہیں ہے"۔

اس شخص نے بتایا "فلاں الماری میں اور فلاں شیلف میں پڑی ہے"۔

خواجہ صاحب نے پوچھا "آپ کو کس نے بتایا؟"

"شیخ محمد اسمٰعیل نے"۔

خواجہ صاحب بڑے بھنائے۔ جب شیخ واپس آئے تو خواجہ صاحب نے کہا۔ "شیخ صاحب آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ ہر شخص کو ہر بات بتا دیتے ہیں۔ کوئی پوچھے تو یہ بھی بتا دینا کہ مسلم ہائی سکول کا خزانہ وہاں پڑا ہے"۔

شیخ صاحب نے جواب دیا "اگر مجھے معلوم ہوا اور کسی نے پوچھ لیا تو ضرور بتا دوں گا۔ جھوٹ ہرگز نہ بولوں گا"

دوسروں کے بارے میں سچ بولنا یا اصول پرستی کا مظاہرہ کرنا بہت آسان ہوتا ہے مگر اپنے بارے میں یا اپنوں کے بارے میں سچ بولنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ تقاضے کمزوری پن کا سبب بن جاتے ہیں۔ مگر شیخ صاحب اپنے ڈھب اور کینڈے کے ایک ہی تھے۔ ایک دفعہ ان کے صاحبزادے نے کہا "ابّا جان!"

"جی!"

"اگر آپ مجھے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ دلوا دیں تو میں امتحان دے سکوں گا"۔

"کیسا سرٹیفکیٹ؟"

"کہ میں گزشتہ دنوں بیمار تھا"۔

"تم بیمار تو نہ تھے"۔

"بے شک میں بیمار نہ تھا۔ یوں میرا ایک سال بچ جائے گا"۔

"یہ کیونکر ممکن ہے؟"

" فلاں ڈاکٹر صاحب آپ کے دوست ہیں۔ وہ آپ کے کہنے پر سرٹیفکیٹ دے دیں گے۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب سرٹیفکیٹ دے دیں۔"

" یوں میرا ایک سال بچ جائے گا۔"

"مگر ــــ!"

"مگر کیا؟"

"میں تمھارا ایک سال بچانے کے لیے جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

ان کی اصول پرستی کی زد میں آکر، جب بچّے کا سال ضائع ہوتا دیکھا تو شیخ صاحب کی اہلیہ نے کہا۔" آپ کی راست بازی نے بچّے کا تو ایک سال ضائع کر دیا۔"

شیخ صاحب کا جواب یہ تھا۔" میں اولاد کی خاطر، اصولوں کو قربان نہیں کر سکتا۔"

شیخ صاحب میں حسِّ مزاح بہت تھی۔ بڑھاپے میں تو اولاد بھی والدین سے بھاگتی ہے۔ مگر یہ ایسے بزرگ تھے جن سے دُور بھاگنے یا اِترانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہمدرد و مشفق، پرائے دکھ اپنانے والے، دوستوں ہی کے نہیں، بدخواہوں کے بھی کام آنے والے، کوئی بھی فرمائش کر دے۔ اُن کے بس میں ہوگا تو کر گزریں گے۔ چاہے اُن کا بھرکس ہی کیوں نہ نکل جائے!

بھرکس کا لفظ میں نے خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ قصّہ سناتا ہوں فیصلہ خود کر لیں کہ لفظ کا استعمال صحیح ہوا کہ نہیں، کیونکہ کسی بھی تحریر میں الفاظ کے چناؤ کا مسئلہ بڑا اہم ہوتا ہے۔ بلکہ تحریر میں اہم مسئلہ الفاظ کے انتخاب ہی کا ہوتا ہے۔ بہر حال یہ

قصّہ اُن دنوں کا ہے جب میں خطوط نمبر مرتب کر رہا تھا۔

کبھی آپ نے نواب محسن الملک کا خط پڑھا ہے ؟ سر سیّد احمد خاں کا خط ؟ مولوی عنایت اللہ دہلوی کا خط ؟ مولانا عبدالماجد دریا بادی کا خط ؟ اگر آپ نے ان کے خطوط، ان کے اپنے ہینڈ رائٹنگ میں پڑھے ہوں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ایسے حضرات کے خطوط پڑھنا کتنے جاں جوکھوں کا کام ہے ۔

جس وقت میں نے جملہ خطوط کو سامنے رکھا۔ انھیں پڑھنے لگا تو میں نے سر کو پیٹ لیا۔ معلوم ہوا کہ مفہوم کو ٹٹولا جا سکتا ہے مگر لفظ بہ لفظ صحیح نہیں پڑھا جا سکتا۔ ایسے خطوط کہ جنھیں پڑھنے کی ضرورت تھی۔ ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں تھے۔ سچ پوچھیں تو ہزاروں !

میں نے اپنی اس پریشانی اور دشواری کا ذکر شیخ صاحب سے کر دیا۔ وہ تو ہر ایک کے لیے زندگی ہی اس اصول کے تحت گزار رہے تھے کہ "اپنے دُکھ مجھے دے دو"۔ بھلا وہ میرے لیے کیوں نہ دوستی کا ہاتھ بڑھاتے۔ اُنھوں نے جھٹ کہا۔ "ان میں سے سر سیّد کے خطوط میں پڑھ دوں گا"۔ سر سیّد کا خط بہ ظاہر صاف نظر آتا ہے مگر الفاظ ٹیڑھے میڑھے اور ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک بڑے پلندے میں سے سر سیّد احمد خاں کے ۱۲۸ خطوط اُٹھائے اور شیخ صاحب کے حوالے کر دیے ۔

دو چار دن کے بعد جا کر خیریت پوچھی تو معلوم ہوا کہ ایک دن میں چار پانچ خطوط سے زیادہ پڑھے ہی نہیں جا سکتے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک لفظ کو بھی پڑھنے میں ایک ایک دو دو گھنٹے صرف ہو رہے ہیں ۔

دس پندرہ دن کے بعد پھر احوال پوچھا۔ کہنے لگے "آپ خطوط کو جلد پڑھنے کے لیے کہتے ہیں۔ میں صبح خطوط کو لے کر بیٹھتا ہوں۔ رات کے گیارہ بجے تک پڑھتا رہتا ہوں۔ باہر کا آنا جانا موقوف کر رکھا ہے۔ پیشاب بھی آتا ہے تو اُسے کہتا ہوں ذرا ٹھہر! اس کے باوجود ساٹھ سے زیادہ خطوط نہیں پڑھ سکا! میں تو وعدہ کر کے پھنس گیا۔"

چنانچہ وہ ایسا پھنسے، ایسا پھنسے کہ پورے تین ماہ تک خطوط پڑھتے رہے اور مجھے دعائیں دیتے رہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس خدمت کو کبھی بجا نہ لاتا۔ کہتے تھے کچھ ادب کی خدمت کا شوق لے ڈوبا۔ کچھ آپ کی محبّت نے انجر پنجر ڈھیلا کر ڈالا۔ بہر حال میرا تو بھرکس نکل گیا۔

ہاں تو جس وقت شیخ صاحب نے مجھ سے خطوط لیے تھے تو اُس وقت کہا تھا کہ خطوط کا پڑھنا کون سا مشکل کام ہے۔ چنانچہ جب اُنھوں نے یہ کہا کہ خطوط کے پڑھنے میں میرا تو بھرکس نکل گیا تو میں نے اُن کا فقرہ اُن پہ چپکایا کہ خطوط کا پڑھنا کونسا مشکل کام ہے۔ اس پر اتنا ہنسے، اتنا ہنسے کہ کہنے لگے کہ آج ساری کلفت دُور ہوگئی۔

میں نے اس پر کہا "یہ تو اچھا ہوا کہ آپ کی کلفت دُور ہوگئی۔ مگر یہ تو بتا دیجیے کہ کام کے دوران آپ نے جس چیز کو روکے رکھا تھا۔ اُسے اب بھی اِذنِ رواں دیا کہ نہیں؟ اس پر شیخ صاحب دیر تک ہنستے رہے اور یہ لطیفہ انھوں نے اپنے متعدد دوستوں کو سنایا۔

ایک لطیفہ اور بھی سنایا کرتے تھے۔ وہ یہ کہ شیخ صاحب شکر کا استعمال زیادہ کیا کرتے تھے۔ ہم ان سے پوچھتے۔ چائے میں کتنی چینی؟ کہہ دیتے تین چار چمچے،

ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا۔

ایک دن ہم شیخ صاحب کے گھر بیٹھے تھے۔ ان میں کچھ ایسے دوست بھی تھے جن کا آرٹ ہی خوشامد تھا۔ چائے آئی۔ میں نے سوچا، چائے بنانے کی سعادت میں حاصل کروں۔ چنانچہ میں نے حسبِ عادت پوچھا۔ کتنی چینی؟ کہنے لگے "ایک چمچہ!"

میں نے کہا "شیخ صاحب یہ کیا چکر ہے کہ جب آپ دوسروں کے ہاں چائے پیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ڈال دو چار پانچ چمچے، مگر اپنے ہاں ایک چمچہ؟"

کہنے لگے (اور حاضرین کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر) "میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چمچے جتنے بھی کم ہوں اچھا ہے"۔

بہ ظاہر یہ بات عام سی ہے۔ سبھی چمچے اور چمچوں کو اسی انداز اور اسی مفہوم میں ادا کرتے ہیں۔ مگر شیخ صاحب کا اِدھر اُدھر دیکھ کر قدرے ایکٹنگ کرنا لطف سے خالی نہ تھا۔

یہ بزرگ تھے مگر پیارے بزرگ، جب کہ ہر ایک بزرگ پیار کے قابل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بزرگ پیار کے قابل ہوتا بھی ہے تو ہم اس سے پیار نہیں کرتے۔ کیونکہ ایک فاصلہ، ایک نسل بیچ میں آکے کھڑی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ جب تک جیئے خوش طبعی سے جیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اور ہمارے درمیان، نہ فاصلہ حائل ہوا اور نہ ایک نسل!

ایک بار میں نے شیخ صاحب سے شعرا کا مختصر سا تذکرہ لکھوایا تھا۔ جو کہ غزل نمبر کے دوسرے ایڈیشن میں شامل ہے۔ جب شیخ صاحب مسوّدہ لائے اور میں نے مسوّدے کو اِدھر اُدھر سے جھانک لیا تو اُنھوں نے میری رائے پوچھی۔

میں نے کہا "پچانوے فیصد جامع!"

میں نے پچانوے فیصد جامع اس لیے کہا تھا کہ تحقیقی کاموں میں صد فی صد والا معاملہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی نہ کوئی پہلو دبتا ہوا رہ جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی تسامح ہو جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی انکشاف ہوتا ہی رہتا ہے۔

مگر "پچانوے فی صد جامع" والی بات پر، انھوں نے کہا "ایک لطیفہ سن لو۔"

میں نے کہا "ارشاد!"

کہنے لگے "جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا تو امتحان میں جس عنوان کے تحت مضمون لکھنے کے لیے کہا گیا، اس موضوع پر میرا اچھا خاصا مطالعہ تھا۔ میں نے خوب دلجمعی سے مضمون لکھا۔

میرے اُستاد نے اس مضمون پر مجھے شاباش دی۔ ساتھ ہی حوصلہ افزائی کے طور پر کہا کہ اتنا اچھا مضمون تو شاید میں بھی نہ لکھ سکتا۔"

اس پر میں نے (یعنی شیخ صاحب نے) اُستادِ مکرّم کی خدمت میں گزارش کی "اس کے باوجود سو میں سے پچانوے نمبر دیے۔"

میرے اُستاد کا جواب یہ تھا "پانچ نمبر اُستادی کے کاٹے ہیں"۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ شیخ صاحب نے طبیعت بڑی مفرّح پائی تھی۔ ایک واقعہ اور سن لیجیے کہ پانی پت میں ایک دکاندار تھے۔ بڑے متین اور وضعدار، علمی ذوق بھی خاصا تھا۔ ادیب اور شاعر آتے جاتے اُن کے ہاں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ نام اُن کا شیخ محمّد نوح تھا۔

ایک دن وہ خاصے پریشان تھے۔ شیخ صاحب نے پوچھا "خیریت تو ہے؟"

محمد نوح تُرت بولے "بیٹے کی کرتوتوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ پھر تفصیل بتانا شروع کر دی۔ اُس نے یہ کیا۔ اُس نے وہ کیا۔ وہ ایسا نکل گیا۔ وہ ویسا نکل گیا۔

شیخ صاحب چُپ چُپ سُنتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔ بالآخر محمد نوح نے کہا "شیخ صاحب میں اپنی بپتا آپ کو سُنا رہا ہوں اور آپ بول ہی نہیں رہے"۔

شیخ صاحب نے چُپکے سے کہہ دیا" میں کیا بولوں۔ وہ تو پسرِ نوح نکلا"۔

سال پہ سال بیتتے جا رہے تھے۔ ہم دُنیا جہان کی باتیں کرتے تھے مگر کبھی گہرے مذہبی معاملات زیرِ بحث نہیں آئے تھے۔ ایک دن ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ شیخ صاحب احمدی ہیں؟"

میں نے جواب میں کہا تھا "آپ جھوٹ کہتے ہیں"۔

پھر میرا دھیان مولانا حالی کی طرف چلا گیا۔ یہ مولانا حالی کی لائبریری کے انچارج تھے۔ لائبریری کا انچارج ہونا اور بات ہے۔ لائبریری کا حافظ ہونا اور بات!

پھر یہ بات ذہن میں آئی کہ حیدر آباد دکن میں ایک میٹنگ ہو رہی تھی۔ مولوی عبدالحق تقریر کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے اُٹھ کر اعتراض کر دیا کہ واقعہ یوں نہیں یوں ہے۔ اس پر مولوی صاحب نے کہا۔ شیخ اسمٰعیل صاحب سے پوچھ لیتے ہیں۔ جو یہ کہیں وہ صحیح۔ چنانچہ شیخ صاحب نے بتایا کہ فلاں کتاب میں، فلاں صفحے پر اور فلاں سطر میں یہ عبارت موجود ہے۔ پھر وہ عبارت لفظ بہ لفظ زبانی سنا بھی دی!

غرض میں شیخ صاحب کو، کسی طرح بھی احمدی ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ آدمی تھے اور بھلے آدمی!

اگر میں شیخ صاحب میں کوئی کوتاہی یا نقص ڈھونڈنا چاہوں گا تو وہ کوئی نہ

ملے گا۔ جتنا چاہیں سر پٹک لیں۔ کوئی نہ ملے گا۔

شیخ صاحب کی ذاتی لائبریری اچھی خاصی ہے۔ ہزاروں کتابیں ہوں گی۔ تھوڑی سی آمدنی میں اتنا بڑا ذخیرہ کوئی معمولی بات نہیں۔ ایسے لوگ ایک وقت کا پیٹ کاٹ کر ہی ایک کتاب خرید سکتے تھے۔

انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں، اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آنا پڑا۔ اکثر مواقع پر کہا کرتے تھے کہ یہ کتاب میرے پاس پانی پت میں تھی۔ فلاں کتاب بھی میرے پاس تھی۔

ہاں تو میں، شیخ صاحب میں کوئی نقص یا خرابی ڈھونڈتے نکلا تھا۔ سوائے اس کوتاہی کے مجھے اُن میں اور کوئی کوتاہی نظر نہ آئی کہ وہ اچھی کتابوں کو دبا لیا کرتے تھے۔

پھر اس میں تمام حربے جائز!

دو ایک بار شیخ صاحب نے مجھ سے بھی چند ایک کتابیں مستعار لیں۔ اُن میں سے جو زیادہ اہمیت کی نہ تھیں۔ واپس کر دیں۔ جو کمیاب تھیں روک لیں۔ کہا "ابھی مجھے ان کی ضرورت ہے"۔

میں نے کچھ عرصے کے بعد، کتابوں کا مطالبہ کیا۔ جواب میں کہنے لگے "کتابیں تو میں نے واپس کر دی تھیں"۔

"اچھا!"

"جی ہاں!"

اس کے بعد شیخ صاحب نے مجھ سے جس کتاب کا بھی مطالبہ کیا۔ میں نے پیش کر دی۔ اور یہ کہہ کر پیش کر دی کہ آپ کی نذر ہے! کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ شیخ صاحب کا

کوئی بھی کمزور پہلو میرے سامنے آئے۔ جب کہ اس کمزور پہلو کو یاروں نے عین دانشمندی قرار دے رکھا ہو۔

شیخ صاحب کے دو بیٹے تھے۔ ایک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک زندہ ہیں۔ جو زندہ ہیں اُن کا نام شیخ مبارک احمد ہے۔ یہ اچھے خاصے ادیب ہیں۔ مگر ادب سے بھاگتے ہیں۔ دو چار کتابیں مرتّب تو کی ہیں مگر ادب کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔

ایک بیٹے تھے شیخ محمدّ احمد پانی پتی، جو بڑے شریف النفس انسان تھے۔ عربی زبان سے ترجمہ اس روانی سے کرتے تھے کہ بابائے اُردو بھی اس روانی سے اُردو نہ بولتے ہوں گے۔ یعنی دس بارہ روز میں دو تین سو صفحات کی کتاب کو اُردو میں منتقل کر دیتے تھے۔

عربی زبان سے اُردو میں، جن ادیبوں نے کتابوں کو منتقل کیا ہو گا۔ اُن میں سب سے زیادہ تعداد محمد احمد کی ہو گی۔ ان کی تو عمر نے وفا نہ کی۔ ورنہ وہ کتابوں کے انبار لگا دیتے۔ اس پر بھی انھوں نے پچاس کے لگ بھگ کتابیں اُردو میں منتقل کر دی ہوں گی۔ جن میں آٹھ سو صفحات تک کی ضخیم کتابیں بھی ہیں۔

ایک بار میں نے شیخ محمدّ اسمٰعیل صاحب سے کہا کہ فلاں کتاب کا مجھے ترجمہ کر دیں۔ کہنے لگے "محمدّ احمد سے کہیے"۔

میں نے کہا "بیٹے کی بجائے باپ کیوں نہ کرے"؟

کہنے لگے "تعمیلِ ارشاد میں عذر تو مجھے بھی نہیں مگر جتنی آسانی اور روانی سے محمدّ احمد ترجمہ کر سکتے ہیں۔ میں نہیں کر سکتا۔ مجھے اتنی قدرت حاصل نہیں!"

شیخ صاحب کا کمال یہ تھا کہ وہ سچّی اور کھری بات ضرور کہیں گے خواہ اس میں اُن

کی سُبکی ہی کا پہلو کیوں نہ نکلے۔ خواہ ان کا کچھ نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے۔

شیخ صاحب اہلِ زبان میں سے نہ تھے۔ جن سے لوگ سندیں پلتے ہیں۔ ایک دو دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے شیخ صاحب سے کوئی لفظ پوچھا۔ جواب میں انھوں نے بتایا۔

"مجھے تو اس کا علم نہیں"۔

اس پر میں نے کہا "اگر آپ لوگوں کا یہ حال ہے تو پھر ہمارا تو اللہ ہی حافظ ہے"۔

اس پر کہا "یہ مسئلہ کل حل ہو جائے گا"۔

"کل کیسے ؟"

"میں اپنی بیوی سے پوچھوں گا اور بتا دوں گا"۔

زبان کے معاملے میں شیخ صاحب اپنی اہلیہ کو سند مانتے تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ زبان کے معاملے میں مجھے بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ مشکل بیوی حل کر دیتی ہے"۔

ایسے ہی ایک موقع پر جب شیخ صاحب نے کہا کہ بیوی سے پوچھ کر بتاؤں گا تو میں نے جواباً کہا "گھر کی سند نہیں چلے گی"۔

"وہ کیوں ؟"

"وہ ایسے کہ میں نے یہ لفظ ایک جگہ لکھا ہے۔ سند کے طور پر یہ حوالہ تو نہیں دیا جا سکتا کہ شیخ صاحب کی اہلیہ سے جا کر پوچھ لیجیے"۔

اس پر خُوب زور سے ہنسے اور کہا "اگر اہلیہ نے تصدیق کر دی تو پھر حوالہ اساتذہ کے کلام سے دوں گا۔ مگر چلوں گا سیڑھی بہ سیڑھی !"

اگر کوئی شخص ان کے ہاں کوئی امانت رکھواتا تھا تو یہ بے حد پریشان ہوتے تھے۔

ان کا سوچنے کا انداز یہ تھا کہ عمرِ مستعار کا اعتبار کیا! مر گیا تو کیا ہو گا۔ احتیاطاً اپنے بیٹے کے نام، بہ طور وصیت یادداشتیں لکھتے جاتے کہ فلاں شخص کی میرے پاس امانت ہے اور وہ فلاں جگہ رکھی ہوئی ہے۔

اگر کوئی ہزار روپیہ دے گیا ہے اور وہ شخص واپس لینے آئے گا تو اُسے سو سو کے بھی وہی نوٹ واپس ملیں گے۔ دس دس کے بھی وہی اور پانچ پانچ کے بھی وہی، مطلب یہ کہ یہ اُس امانت کی ایک پوٹلی بنا لیتے تھے۔ پھر اُسے کسی جگہ احتیاط سے رکھ دیتے تھے۔ مطالبے پر وہی رقم، جوں کی توں نکال کر دے دیتے تھے۔

کہا کرتے تھے کہ امانت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اصل چیز ہی واپس کی جائے۔ ہزار روپیہ واپس کرنا اُتنا اہم نہیں جتنا کہ یہ ہزار کے نوٹ بھی وہی ہوں جو کہ بوقتِ امانت سپرد کیے گئے تھے۔

شیخ صاحب کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ "میں نے جب بھی شیخ صاحب کو آزمایا۔ وہ دوستی کے پلڑے میں بہت بھاری نکلے"۔ ان کے دوست کا کہنا ہے کہ مجھے اچانک خبر ملی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اتفاق کہ اس وقت میرے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ گاؤں تک پہنچ سکتا۔ اِدھر اُدھر دوستوں پہ نگاہ دوڑائی تو فیصلہ یہ کیا کہ شیخ صاحب کے پاس چلنا چاہیے۔

چنانچہ جب میں نے شیخ صاحب کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ ساتھ ہی اپنی ضرورت کا اظہار کیا تو رنجیدہ ہو گئے۔ چپکے سے اُٹھے اور تیس روپے لا کر مجھے دے دیے اور کہا۔ اس وقت گھر میں صرف اتنے ہی روپے تھے۔ ساتھ ہی یہ کہا کہ میں اس لمحے یہ بھی سوچنا نہیں چاہتا کہ میری اپنی فوری ضرورتوں کا کیا بنے گا؟

متحدہ ہندوستان میں مسلمان کی پہچان یہ بھی تھی کہ وہ ترکی ٹوپی پہنتا تھا۔ اُن دنوں ترکی ٹوپی کا رواج عام تھا۔ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ پھر ترکی ٹوپی پہننے والے خال خال رہ گئے۔ پاکستان بننے کے بعد تو ترکی ٹوپی عنقا ہوگئی۔ مگر شیخ صاحب ترکی ٹوپی ہی پہنتے رہے۔ انھوں نے دو اور ترکی ٹوپی پہننے والوں سے بھی دوستی کر رکھی تھی۔ ایک میاں ایم اسلم سے، دوسرے اشرف صبوحی سے، ان تینوں میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ میرے نزدیک دوستی کا سبب، ترکی ٹوپیاں! جب یہ تینوں باہر نکلتے تو یار کہتے، اصحابِ ثلاثہ جا رہے ہیں۔

میاں ایم اسلم کو بھی دعوتیں کرنے کا شوق تھا۔ شیخ صاحب کو بھی لپکا، کبھی دعوت اُن کے ہاں، کبھی ان کے ہاں، مزے میں، مَیں اور اشرف صبوحی تھے۔ جو ان میں سے کسی کی دعوت کو ردّ نہ کرتے تھے۔ اگر کبھی ہمیں غیرت نے للکارا بھی، تو ان کا خلوص لے ڈوبا، حکم کہ سارے کام چھوڑ دینا اور دعوت میں ضرور آنا، یہ فقرہ ایم اسلم کو بھی ازبر تھا اور شیخ صاحب کو بھی ازبر، بس ان بزرگوں کی دعوتوں میں ایک ذرا سا فرق ضرور تھا۔ ایم اسلم پیٹ کا بھی انتظام کرتے تھے اور ذہن کا بھی، یعنی کھاؤ بھی اور سنو بھی۔ شیخ صاحب کی دعوت کا انداز یہ تھا کہ بھئی میرے پاس تو خلوص ہی خلوص ہے اُسے جس کھاتے میں چاہو ڈال دو!

شیخ صاحب بڑے وضعدار انسان تھے۔ جو وطیرہ پہلے دن رہا۔ اُسے آخر تک نبھایا۔ شیخ صاحب ہمارے ہاں عید کے دوسرے روز، صبح آٹھ بجے کے قریب آیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ایک دو برس نہیں پورے اکیس برس تک نبھایا۔ آندھی ہو یا طوفان، وہ پہنچیں گے ضرور!

ایک سال وہ نہ آئے۔ آٹھ بج گئے۔ نو بج گئے، دس بج گئے۔ ہم دونوں میاں بیوی

پریشان، طے ہو رہا تھا کہ اُن کی خیریت پوچھنے کے لیے نکلیں کہ دروازے پر اُن کی چھڑی کی ٹک ٹک سنائی دی۔

ہماری جان میں جان آئی۔ دونوں نے بیک وقت کہا "لیجیے شیخ صاحب تو آ گئے۔"

دیکھا تو ایک ہاتھ میں سوٹ کیس ہے۔ ملتے ہی کہنے لگے کہ طفیل صاحب میں بڑا شرمندہ ہوں کہ وقت پر پہنچ نہ سکا۔ میں سیدھا اسٹیشن سے آپ کے ہاں آ رہا ہوں۔ آپ سے ملنے کے بعد گھر جاؤں گا۔ میں وقت پر پہنچ ہی جاتا مگر گاڑی لیٹ ہو گئی۔

آخری دنوں میں ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ ایسے ہی عالم میں عید آ گئی۔ اُنھوں نے اس حالت میں بھی، اُٹھنے اور ہمارے ہاں پہنچنے کی سعی کی۔ اُٹھے اور گر گئے۔ ہمارے ہاں نہ پہنچ سکے۔

بارہ بجے کے قریب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیونکہ وہ تو اپنی تکلیف کی وجہ سے آ نہیں سکتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آج میں حاضر نہ ہو سکا۔ اکیس برس پہلے کا عہد ٹوٹ گیا۔"

اُن کے صاحبزادے پاس ہی کھڑے تھے۔ کہنے لگے "آپ کی طرف جانے لگے تھے کہ گر گئے۔"

میں نے پوچھا "چوٹ تو نہیں آئی؟"

اُس وقت تو شیخ صاحب خاموش رہے۔ جب صاحبزادے چائے لانے کے لیے اُٹھے تو کہنے لگے۔ بڑی سخت چوٹ لگی ہے۔ مگر میں نے اپنے بیٹے کے سامنے

یہ بات نہیں کہی۔ اس لیے کہ دوست کی خاطر، جو تکلیف پہنچے۔ اُسے تکلیف نہیں کہتے۔"

اگر شیخ صاحب پر کوئی ذرا سی بھی مہربانی کر دیتا تو وہ اُسے زندگی بھر بھُولتے نہ تھے۔ اتنا شکرگزار ہوتے تھے کہ جس کی حد نہیں۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب کے زمانے میں، پرائیڈ آف پرفارمنس کے طور پر ادیبوں اور شاعروں کو دس ہزار کا انعام ملا کرتا تھا۔ اُس انعام کو حاصل کرنے کے لیے بڑے بڑے گھوڑے اور بڑے بڑے گھوڑے دوڑائے جاتے تھے۔ سفارشیں اور بڑی بڑی سفارشیں کرائی جاتی تھیں۔ یوں کئی لوگوں کی قلعی بھی کھُلی!

اُس زمانے میں جو مرکزی سیکرٹری تعلیمات تھے اُن کا نام تھا شیخ منظور الٰہی، میں اسلام آباد میں منظور صاحب کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ منظور صاحب نے مجھے بتایا کہ "اس بار حکومت آپ کو حُسنِ کارکردگی کا انعام دے رہی ہے۔ سارے پراسس ہو چکے ہیں۔ وزیر تعلیم شمس الحق صاحب کے بھی دستخط ہو چکے ہیں۔"

میں نے منظور صاحب کو چھیڑا "یہ دوستی کا انعام ہے یا ادبی خدمات کا؟"

منظور صاحب نے فرمایا "یہ میری رائے نہیں۔ سب کی رائے ہے اور یہ انعام آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں ملے گا۔"

ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں نامور سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام آ گئے۔ اُنھوں نے اسی موضوع پر بات کی اور منظور صاحب سے کہا کہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کی ادب کے سلسلے میں بڑی خدمات ہیں۔ ایک سو سے زائد کتابیں لکھ چکے ہیں ضعیف العمر ہیں۔ اگر اس بار اُنھیں حُسنِ کارکردگی کا انعام مل جائے تو بڑا کرم ہو۔"

اس پر منظور صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں چُپ رہا۔

جب ڈاکٹر عبدالسلام اُٹھ کر چلے گئے تو میں نے بھی منظور صاحب سے کہا "یہ انعام شیخ صاحب کو ہی ملنا چاہیے۔ ضعیف بھی ہیں۔ خدمات بھی ہیں۔ ضرورت مند بھی ہیں"۔
منظور صاحب نے کہا "اگر آپ نے اس بار یہ موقع ضائع کر دیا تو پھر یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا"۔

میں نے کہا "میری فکر نہ کریں۔ شیخ صاحب کو انعام دلوائیں"۔ چنانچہ اس سال حسنِ کارکردگی کا انعام شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی کو ملا۔
کسی طرح سے اس بات کی اطلاع شیخ اسمٰعیل صاحب تک پہنچی۔ جب تک جئے مجھے دعائیں دیتے رہے۔ انھیں انعام میں تو صرف دس ہزار روپے ملے تھے۔ مگر انھوں نے مجھے دعائیں لاکھوں لاکھ دیں۔ وہ اپنے آپ کو فائدے میں سمجھتے رہے اور میں اپنے آپ کو!
ایک موقع پر شیخ صاحب نے ایک تولیہ نما چیز دکھائی۔ پوچھا گیا "یہ کیا ہے؟" کہنے لگے غور سے دیکھیے۔ دیکھا تو چھوٹے چھوٹے دھاگوں سے، تولیہ نما چیز بنی ہوئی تھی۔ جو لمبائی اور چوڑائی میں ڈیڑھ گز اور ایک گز کے قریب ہو گی۔
کہنے لگے "یہ میری والدہ کا کارنامہ ہے"۔
"کارنامہ؟"
"جی ہاں کارنامہ؟"
بازار سے جو سودا سلف لایا جاتا تھا۔ اُن پُڑیوں پر جو دھاگا، دکاندار باندھ کر دیتے تھے، اُسے میری والدہ اکٹھا کرتی رہیں۔ نہ جانے کتنے برس! جب اتنے سارے دھاگے جمع ہو گئے تو والدہ نے انھیں مٹکے سے نکالا اور یہ تولیہ بنا ڈالا"۔

حیرت سے میرا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ پہلے ایک ایک دھاگا اکٹھا کیا۔ پھر ایک ایک دھاگا جوڑا۔

ادب کی ریاضت کے باب میں، شیخ صاحب نے جو کچھ بھی کیا۔ اُس پر مجھے تو حیرت نہیں ہوتی۔ یہی ناکہ سوسواسو کے قریب کتابیں لکھیں۔ یہی ناکہ سینکڑوں مقالات ادق موضوعات پر لکھ ڈالے۔ حیرت اس لیے نہیں ہوتی کہ انھیں والدہ ایک رستہ دکھا گئی تھیں۔

اُنھوں نے بھی جتنا کام کیا۔ وہ بھی ادب کی پُڑیوں پر سے، دھاگے ہی اکٹھا کرنے کا کام ہے۔

اقبال صاحب

میرا دل چاہتا ہے کہ اقبال صلاح الدین کے بارے میں مضمون لکھوں۔ شاید نہ لکھ سکوں۔ کیونکہ وقت گزارنا اور بات ہے اور مضمون لکھنا اور بات!

خود ہی سوچیے کہ ہم نہ تو کبھی اکٹھے کھیلے۔ نہ ہی کھُل کھیلے۔ لہذا کیسا مضمون؟ کیسی مضمون آفرینی! بہرحال وہبی قوتوں سے کام لے کر مضمون کی ابتدا کرتا ہوں۔ باقی اللہ مالک!

یہ بہت لیے دیے رہتے ہیں۔ کھُل کر سامنے نہیں آتے۔ انھیں کما حقہٗ کسی نے نہ جانا۔ نہ بہن بھائیوں نے، نہ ماں باپ نے، نہ یار دوستوں نے، انھوں نے اپنے آپ کو خدا سے بھی چھپایا ہوگا۔ مگر وہ ذات تو سب کا حال جانتی ہے مگر ان کی اپنی کوشش تو یہی رہی ہوگی کہ اللہ میاں کو بھی چکمہ دو!

یہ بہت دھیمے مزاج کے آدمی ہیں۔ دھیمے کے معنی یہ نہیں کہ انھیں غصّہ نہیں آتا۔ آتا ہے مگر وہ غصّہ پُرشور نہیں ہوتا یعنی محلّے والے نہیں سُنتے۔ اگر خلافِ طبیعت کوئی واقعہ ہوجائے تو پھر یہ بھی ایسے نوکیلے فقرے پھینکتے ہیں کہ ٹیسیں اُٹھتی ہیں۔

یہ بہت کم گو ہیں۔ لفظوں کی کفایت کے بادشاہ! کوشش کرتے ہیں کہ کسی بھی

معاملے میں بول کے نہ دکھایا جائے۔ بے شک دورانِ گفتگو چبھتے ہوئے فقرے ادا کرتے رہیں گے۔ مگر گفتگو میں "مردانہ پن" نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مخالف فریق، انھیں کمزور فریق جان کر قلمی حملے کرتا رہتا ہے۔ چونکہ ان کے گرد حصار ہے شرافت کا، بُردباری کا، علم کا، اس لیے بالآخر زچ مخالف فریق ہی کو ہونا پڑتا ہے۔

کئی لوگ "منہ زبانی" بڑے ادیب ہوتے ہیں۔ کئی تحریری طور پر، ان کا بڑاپن بھی تحریری طور پر ہے۔ زبانی کچھ نہیں۔ اُنھوں نے بڑے اور بڑے بڑے کام کیے اور اگر وہ دوسرے بڑے ناموں سے چھپے تو اُنھوں نے چُوں تک نہ کی۔ مگر جب انھیں ایسے معاملات میں "کچھ نہ ہونے" کی تہمت کی بنیاد پر چھیڑا جاتا ہے تو پھر یہ بھی دوسرے کی علمی قابلیت کے بخیے اُدھیڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ ایسے کئی تماشے میں نے دیکھے ہیں۔ ان کی طبیعت میں قلندرانہ شان ہے۔ مگر بعض مواقع پر اور صرف بعض مواقع پر، یہ "جلالتہ الملک" بھی بن جاتے ہیں۔

ایک رُخ یہ بھی ہے کہ اچھے خاصے صابر ہیں۔ صابر ان معنوں میں کہ دوستوں کی زیادتیوں کا اسٹاک کرتے رہتے ہیں۔ یعنی فوراً حساب بے باق نہیں کرتے کسی نے ایک زیادتی کی تو گرہ میں باندھ لی۔ دوسری زیادتی کی تو دوسری گرہ لگالی۔ تیسری کو تیسری گرہ، حتیٰ کہ ایک دن پھٹ پڑیں گے۔ جملہ زیادتیوں کی نمائش لگا دیں گے۔ پھر ترتیب وار گنوائیں گے۔ فلاں موقع پر یہ، فلاں موقع پر وہ، یعنی اصل اسٹاک کے علاوہ وہ زیادتیاں بھی دکھلا دیں گے۔ جنھیں معرضِ وجود میں آنا باقی ہوگا۔

مجھے ان کے گھر کے ایک بھیدی سے علم ہوا کہ یہ واقعی دھیمے مزاج کے آدمی ہیں یہ بھی شنید ہے کہ ان کی بیگم کا مزاج گرم خشک ہے۔ چھ سات سال پہلے کا ایک قصہ

ہے کہ ان کی بیگم موڈ میں آگئیں۔ پھر کیا تھا۔گھر کی باتیں دیواریں پھاند گئیں۔اُس وقت گھر میں والدہ تو تھیں۔ والد صاحب موجود نہ تھے۔ والد صاحب بھی گرم مزاج کے آدمی، گھر پہنچے۔ باتیں سُنیں تو ایکدم فیصلہ! طلاق دے دو۔ دوسری شادی کرا دوں گا۔"

پھر باپ بیٹے میں مکالمے یوں ہوئے۔

باپ: "میں کہتا ہوں۔ طلاق دے دو۔"

بیٹا: "تنگ تو میں بھی بہت ہوں۔ مگر دوسری شادی نہ کروں گا۔"

باپ نے استفسار کیا۔"کیوں؟"

بیٹا سر جھکا کے بولا۔"ہو سکتا ہے کہ دوسری اس سے بُری نکلے۔"

انھوں نے اپنے گاؤں میں، اپنے گھر کو اچھا خاصا آئیڈیل بنا رکھا ہے۔ آئیڈیل ان معنوں میں نہیں کہ وہاں دُنیا جہان کی آسائشیں ارزاں ہیں۔ بلکہ ان معنوں میں آئیڈیل کہ جنھیں ادیب اور شاعر آئیڈیل کہتے ہیں۔ مثلاً سبزہ ہی سبزہ، پھول ہی پھول والا ماحول، مکان کے چاروں طرف پاپولر کے اُونچے اونچے درخت، بیچ میں مکان، مکان کے ساتھ باغیچہ، جس میں گلاب، چنبیلی اور رات کی رانی کے علاوہ موسمی پھولوں کی بھرمار، نگہداشت بھی کسی دوسرے کے سپرد نہیں، بلکہ خود کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر پودوں اور دوستوں کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو وہ مُرجھا جاتے ہیں۔ تعلقات بھی، پھول بھی!

گاؤں میں نیم، بکائن، شیشم کے درخت، اکثر بے جگہ اُگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ انھیں وہاں سے اکھاڑیں گے اور لائن میں، ان کے صحیح مقام پر لگا دیں گے۔ یہی رویہ ہے ان کا ادیبوں سے متعلق، اگر وہ غلط جگہ لٹکے ہوئے ہوں گے تو یہ انھیں ان

کے بہتر مقام تک پہنچانے میں، ان کی مدد کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی راست بازی سے انھیں، اپنے ہمعصروں میں پسندیدہ مقام حاصل ہے۔ جو دوست انھیں پسند نہیں کرتے وہ کسی کو بھی پسند نہیں کرتے۔

جس طرح انھیں پھولوں کا ہوکا ہے۔ اُسی طرح خوشبو کا بھی ہے۔ عطریات اور سینٹ کی شیشیاں تو بہت سی ان کے پاس ہوں گی مگر یہ انھیں استعمال کم ہی کریں گے۔ ان معنوں میں یہ اتنے عشق باز نہیں جتنے کہ ہوس کار!

ان کی شادی کا قصّہ بھی عجیب ہے۔ جب بھی ان کی والدہ یا والد نے شادی کا ذکر چھیڑا۔ انھوں نے ایک بار بھی ہاں نہ کی۔ ہمیشہ نہ نہ نہ، جب ان کے والدین ان کی شادی کے سلسلے میں مایوس ہو گئے تو ان کے ایک دوست نے بات چلائی۔ اگر خاندان میں شادی نہیں کرنا تو پھر جہاں بھی کرنا ہے نشاندہی کر دو۔

انھوں نے بتا دیا کہ گاؤں کے فلاں مکان میں ایک لڑکی ہے۔ مگر مکان کی نشاندہی غلط کر دی۔ محض اتفاق کی بات کہ پہلے یہ لوگ پہنچے اصل مکان پر، مگر اس نیّت سے کہ ساتھ والے مکین کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر کے وہاں پہنچیں۔

جب مدعا بیان کیا تو صاحبِ مکان نے کہا۔ اِدھر اُدھر جانے کی ضرورت نہیں۔ گھر میں لڑکی موجود ہے۔ مگر والدین نے تو شادی وہاں کرنا تھی کہ جو مکان انھوں نے بتایا تھا۔ مطلب یہ کہ گھر والے، اُس لڑکی کے رشتے سے انکار کر آئے جس سے کہ یہ چاہتے تھے۔ چونکہ مکان کی نشاندہی غلط کر بیٹھے تھے اس لیے وہاں بھی رشتہ نہ ہو سکا کیونکہ مقصود لڑکی کا گھر پہلا ہی تھا۔

اس کے بعد، یہ شادی کے مسئلے میں اتنے بددل ہوئے کہ اُنھوں نے اعلان

کر دیا کہ جیو اور جیسی لڑکی ملے ۔ بندہ حاضر!

ان کی طبیعت میں، ایک عجیب قسم کی زبردستی بھی ہے ۔ یعنی جو سوچ لیں ، چاہتے ہیں کہ دوسرا اُس پہ بلا چُون و چرا عمل کرے ۔ خلافِ طبیعت ایک دن مجھ سے کہنے لگے "مجھ پر مضمون لکھو"۔

"لکھوں گا ۔ جلدی کیا ہے؟"

"جلدی ہے"۔

"مثلاً ؟"

"میری کتاب "باردی سار" کی تقریب ہے ۔ مضمون بھی لکھیں ۔ صدارت بھی کریں"۔

پہلے تو میں مضمون لکھنے پر راضی نہ تھا ۔ اس پہ صدارت کی بپتا نے مجھے مزید بدمزہ کیا ۔ اس پر مستزاد یہ کہ مضمون پنجابی میں لکھنا ہو گا ۔

یقین جانیے میں اس فرمائش پر حد درجہ بلکہ سہ درجہ پریشان ہوا ۔ میں نے سوچا کہ ذہن پر جو بوجھ پڑا ہے مضمون کا ، صدارت کا ، پنجابی کا ، ان بھاری پتھروں کو ایک ایک کر کے اُتار پھینکوں! میں نے مسکین بن کر کہا "صدارت نہ کروں گا"۔

"کرنی پڑے گی"۔

"پنجابی میں نہ لکھوں گا"۔

"لکھنا پڑے گا"۔

چنانچہ ان کی زبردستی اور میری بے بسی والا وہ دن آیا کہ میں صدارت کی کرسی پہ بیٹھا تھا اور پنجابی زبان میں مضمون پڑھ رہا تھا ۔

جی چاہتا ہے کہ یہاں پنجابی مضمون لکھنے اور پڑھنے کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دوں۔ ہمت کر کے پنجابی میں مضمون تو لکھ لیا تھا مگر جب پڑھنے کے لیے اُٹھا۔ ٹھیک ٹھاک اُٹھا۔ آدھا مضمون سلیقے سے پڑھ بھی گیا۔ پھر اٹکنے لگ گیا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ مضمون پڑھنا مشکل ہو گیا۔ سننے والوں کو محسوس ہونے لگا کہ جیسے مضمون بیوی سے لکھوا کے لایا ہوں۔ چونکہ میں اس محفل کا صدر تھا۔ اس لیے بخش دیا گیا۔ ورنہ اقبال صلاح الدین نے مجھے رسوا کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

انھیں شوق ہے کہ دوسرا گرے اور چاروں شانے چت گرے۔ اگر انھیں یہ شوق نہ ہوتا تو یہ نہ مجھے پنجابی میں مضمون پڑھنے کے لیے کہتے اور نہ یہ اپنے ساتھیوں سے آگے آگے ہوتے۔ اسی بچپنی کے شوق نے اُنھیں پڑھنے پر مجبور کیا۔ علم حاصل کیا اور اس میں کمال حاصل کیا۔ بات وہی چاروں شانے چت گرانے والی!

سُنا ہے کہ جب اُنھوں نے گیارہویں بارہویں کا امتحان دیا تو اُن کے اُستاد نے ہر طالب علم کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیے۔ کسی کے متعلق کچھ کہا۔ کسی کے متعلق کچھ۔ ان کے متعلق یہ کہا کہ یہ ایک سمندر ہے جس کی تہ تک پہنچنا میرے بس کی بات نہیں!

اگر محوِ تکلم ہوں تو ان کی باتیں دل کو موہ لیتی ہیں۔ متاثر بھی کرتی ہیں۔ ادب تو خیر ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ویسے ادب اوڑھنا بچھونا تو کئی ایک اور کا بھی ہے مگر ادب میں ان کا اتنا ورک حیرت انگیز ہے۔ قلمی کتابوں کے یہ شناور، پرانی کتابوں کے یہ پارکھ، حوالے ازبر، نزاکتیں معلوم، سنہ معلوم، غرض ایک نسخے سے دوسرے نسخے کا فرق معلوم، یہ صرف ادب پر ہی انحصار ٹی نہیں بلکہ ہر سمت نکل جائیں گے۔ مثلاً اس

سے پہلے شہاب ثاقب کہاں کہاں گرا، اس کی جملہ معلومات معلوم، اب سکائی لیب کہاں گرے گا۔ اس کے بارے میں، اخبار میں چھپنے والی جملہ جزئیات معلوم، پھر یہ بھی معلوم کہ ایک نیا تھرمامیٹر ایجاد ہوا ہے۔ جسم کے کسی حصے پر لگا دیا جائے۔ بخار کا درجہ معلوم ہو جائے گا۔ یہ بھی بتایا۔ ایک عینک ایجاد ہوئی ہے۔ جو دیوار کے دوسری طرف کا آدمی دکھا دے گی۔ حتیٰ کہ ننگا دکھا دے گی۔

اُدھر یہ بھی بتاتے ہیں کہ سائنس نے اگر اتنی ترقی کر لی ہے تو گاؤں کے اَن پڑھ لوگ بھی کچھ کم علم نہیں رکھتے۔ مثلاً ہمارا گاؤں ساہیوال میں ہے۔ تاریخ کے اوراق میں اس کا نام قلعہ و نور تھا۔ اب چک نمبر ۴۰ ہے۔ یہ گاؤں پہلے بھی آباد تھا۔ اس کے بعد اُجڑ گیا۔ دس بارہ فٹ مٹی کھودیں تو آبادی کا نشان ملے گا۔ تغلقوں کے عہد میں یہ گاؤں آباد تھا۔ وہی دور شہزادہ محمّد شہید کا، جو ادیبوں کا مربی تھا۔

ذکر ہو رہا تھا کہ گاؤں میں اَن پڑھ لوگ بھی، بہت کچھ جانتے ہیں اور یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے گاؤں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو آسمان کی طرف دیکھ کر یہ بتا دیں گے کہ اس جگہ پر کنواں موجود ہے۔ کھودیں گے تو کنواں ملے گا۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ صرف "ادیبیئے" نہیں بلکہ "جہاں دیدئیے" بھی ہیں۔ یعنی ادیب جو اپنے آپ سے بھی بے خبر ہوتا ہے۔ یہ دنیا جہان سے باخبر ہیں۔

اخبار میں پڑھا کہ سیّد وزیر الحسن عابدی کا انتقال ہو گیا ہے۔ یاد آیا کہ اقبال صلاح الدین بھی عابدی صاحب کے شاگرد ہیں۔ عابدی صاحب فارسی کے فاضل تھے۔ غالبیات پر بھی اتھارٹی تھے۔ ان کا لسانیات اور لُغت کا علم بہت تھا۔

چنانچہ وہ نقشہ بھی سامنے آیا کہ عابدی صاحب آگے آگے جا رہے ہیں اور اقبال صلاح الدین پیچھے پیچھے کتابوں اور کاغذوں کے پلندے اُٹھائے۔ جیسے بقراط کے پیچھے سقراط!

ایک دن میں نے عابدی صاحب کے سامنے اقبال صلاح الدین سے کہا "غالب کے کسی نئے پہلو پر مضمون لکھ دیجئے۔"

عابدی صاحب جھٹ بولے۔ "ابھی انھیں غالب پر قلم اُٹھانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔"

"کیوں؟"

"اس کا سبب ہم جانتے ہیں۔"

وہ سبب میں آج تک نہ جان سکا۔ نہ ہی پھر کبھی عابدی صاحب سے اس موضوع پر بات ہوئی۔ جہاں تک عابدی صاحب کے شاگردوں میں اقبال صلاح الدین کا رتبہ ہے۔ وہ منفرد ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جب یہ ان کی باقاعدہ شاگردی میں تھے۔ اُن دنوں ہی عابدی صاحب کی کچھ کتابیں منظرِ عام پر آسکیں۔ جب سے یہ کھنچ گئے تھے۔ اُن کے کام بھی اُدھورے رہ گئے۔ عابدی صاحب ایسے لوگ روز پیدا نہ ہوں گے۔ افسوس کہ وہ اپنی اُفتادِ طبع کے ہاتھوں زیادہ کام نہ کر سکے۔

میرے نزدیک، ادب کے معاملات میں، جتنا فیض انھیں وزیرالحسن عابدی سے پہنچا اور کسی سے نہیں پہنچا۔ اُنھوں نے ہی انھیں، اس راستے پر ڈالا کہ ادب کے بحرِ زخّار میں کود پڑے اور موتی رولے۔

بہر حال یہ بہ حیثیت اُستاد جن سے متاثر ہیں۔ وہ ظہورالحق قریشی ہیں۔ جن سے یہ ابتدائی جماعتوں میں پڑھے۔ ہر اعتبار سے اُنھوں نے انھیں مکمل انسان بنایا۔ قریشی صاحب

شاعر بھی تھے۔ انھیں مختلف علوم پر عبور بھی تھا۔ پھر وہ سچّے اُستاد تھے۔ شاگرد کے رہبر بھی نگہبان بھی!

بے شک اُنھوں نے اپنے اساتذہ سے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ مگر ان کے اساتذہ نے بھی ان سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا ہوگا۔

یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو ان کے ساتھیوں کے پاس ضروری نوٹس تھے۔ اُنھوں نے اُن نوٹس کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لڑکوں نے بخل سے کام لیا۔ تب اُنھوں نے جملہ کتابیں اُٹھائیں اور اُنھیں گھول کے پی لیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کے ایک اُستاد نے فرمایا کہ فلاں باب میں فلاں بادشاہ کا ذکر موجود ہے۔ اُس پر اُنھوں نے کہا "سر! اس باب کا تعلق فلاں بادشاہ سے نہیں ہے۔ اس پر ان کے اُستاد نے کہا۔ ایسی بات کرنا ہو تو میرے دفتر میں آکے کیا کرو!"

ظاہر ہے کہ جب یہ اپنے اُستاد کو یوں زچ کرتے ہوں گے تو اُنھوں نے بھی اُستادی ہاتھ دکھلائے ہوں گے۔ چنانچہ دکھلائے۔ اُن کے پاس جتنے پرچے تھے۔ اُن میں یہ تھرڈ ڈویژن پاس ہوئے۔ باقی سب پرچوں میں فرسٹ ڈویژن! یہی وجہ ہے کہ میں انھیں اکثر سمجھاتا ہوں کہ دیکھو اقبال صلاح الدین! سچ نہ بولا کرو۔ اس پر ان کا جواب یہ ہوتا ہے۔ بے شک آپ بھی مجھے تھرڈ ڈویژن دے دیں مگر سچ ضرور بولوں گا۔

یہ اپنی تکالیف کا ذکر کسی سے نہیں کرتے۔ مالی دُکھ ہوں یا سماجی پریشانیاں، دوستوں کی زیادتیاں ہوں یا اپنوں کے لگائے ہوئے چرکے! یہ سب کچھ سہتے رہیں گے۔ اُف تک نہ کریں گے۔ جیسے وہ دُکھ، وہ زیادتیاں، وہ پریشانیاں، ان کی ذاتی ملکیت ہوں۔ اُن میں کوئی دوسرا حصّہ دار نہ ہو۔

اس ملکیت اور اسی افتادِ طبع کی پاداش میں، انھیں ایک دفعہ نمونیہ ہو گیا۔ یہ نمونیے پر بھی سانپ بن کے بیٹھ گئے۔ جب نمونیے کا زور بڑھا۔ نڈھال ہوئے۔ بے سُدھ ہوئے تو آدھی رات کے وقت کراہنے لگے۔ والدہ اُٹھیں۔ پوچھا "بیٹا کیا بات ہے؟"

ان کا جواب یہ تھا۔ "ایں۔ ایں۔"

والدہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "بتاتے کیوں نہیں؟"

ان کا پھر جواب یہ تھا۔ "ایں۔ ایں۔"

والدہ نے گھبرا کر، ان کے والد کو اُٹھایا۔ وہ طبیب، اُنھوں نے دیکھا کہ نمونیے کا حملہ شدید ہے تو وہ خفا ہوئے۔ "بتایا کیوں نہیں؟"

والدہ صاحبہ کو تو انھوں نے سوائے ایں۔ ایں کے کوئی جواب نہیں دیا تھا مگر والد صاحب کے تیوروں کو دیکھ کر مفصّل جواب دیا۔ "یہ مہمان میرا ہے۔ آپ کو زحمت کیوں دیتا؟"

کچھ نہ کہنے یا کچھ نہ طلب کرنے کی عادت ان میں تکلیف دہ حد تک راسخ ہے۔ پھر اس میں استقامت مزید حیران کن ہے۔ مثلاً شادی سے آٹھ سال پہلے، انھیں بخار ہوا۔ عادت کے مطابق اپنی تکلیف کا حال کسی سے نہ کہا۔ اُدھر عادت کے مطابق کھانے میں جو ملے وہ کھا لینا ان کا وطیرہ تھا۔ چونکہ بخار تھا۔ اس لیے اُنھوں نے دانستہ دو چار دن کے لیے دہی کا استعمال ترک کیا۔ بخار والے عارضے کا کسی کو علم نہ تھا۔ والدہ نے سمجھ لیا کہ انھیں اب دہی مرغوب نہیں رہا۔ چنانچہ کھانے میں دہی کا رکھنا موقوف کر دیا گیا۔

شادی ہوئی تو والدہ نے ان کی بیوی کو بتایا کہ انھیں یہ یہ چیزیں پسند ہیں اور

یہ یہ ناپسند، چنانچہ بیوی نے بھی دہی نہ چکھایا۔ یوں چار پانچ سال گزر گئے۔

ایک دن گھر میں سسرالی رشتہ داروں کی دعوت تھی۔ اس میں دہی رکھا گیا چنانچہ اُنھوں نے خُوب جی بھر کے کھایا۔ گھر والے حیران ہوئے۔ استفسار پر انھوں نے بتایا۔ چونکہ مجھے دہی دیا نہیں گیا اور میں نے مانگا نہیں۔ اس لیے کیا کرتا۔ آج جب سامنے آیا تو کھا لیا۔

دیکھا آپ نے اپنی مرغوب چیز کو بارہ تیرہ برس تک اس لیے نہ کھایا کہ کسی نے سامنے لاکر نہیں رکھا۔ کچھ طلب کرنا چونکہ ان کی سرشت میں شامل نہ تھا۔ اس لیے اتنی مدّت دہی کے بغیر گزار دی۔ جب کہ گھر میں دُودھ اور دہی بہ افراط تھا۔

میں ان کی ایسی ایسی اُوٹ پٹانگ عادتوں کو دیکھتا ہوں تو پریشان ہوتا ہوں۔ بھاگ بھری بھی پریشان ہو گی (یہ بیوی کو پیار میں بھاگ بھری کہتے ہیں) ان کی عدم طلب کا مسئلہ بڑے گُل کھلاتا ہو گا۔

ان میں ایک خامی تو بڑی عجیب و غریب ہے۔ وہ یہ کہ یہ کسی سے بھی کسی بھی نوعیت کی محبّت کا اظہار نہیں کر سکتے۔ نہ بچّے سے پدرانہ محبّت کا، نہ بھائیوں سے برادرانہ محبّت کا، نہ بیوی سے شوہرانہ محبّت کا۔ یہ روش، یہ ادا، یا یہ نقص ان کی طبیعت میں کچھ ایسا رچ بس گیا ہے کہ جیسے یہ نامکمل انسان ہوں۔ اس لیے کہ رونے کے وقت رونا چاہیے۔ ہنسنے کے وقت ہنسنا چاہیے۔ بالکل اسی طرح محبّت کے وقت محبّت کرنی چاہیے۔

سینما یہ نہیں دیکھتے۔ ٹیلی ویژن یہ نہیں دیکھتے۔ کلب میں یہ نہیں جاتے۔ باغ میں سیر کو یہ نہیں نکلتے۔ شام کو انارکلی کا چکر یہ نہیں لگاتے۔ غرض اس اعتبار سے اگر نامکمل نہیں

تو اُدھورے آدمی ضرور ہیں۔ اگر ادھورے اور نامکمل کا مفہوم ایک ہی ہو تو میں یہ کہوں گا کہ یہ شخص خوشیوں کا دشمن ہے۔

انھوں نے آج تک کسی کو گالی نہیں دی۔ یعنی آج تک کوئی بھی اچھا کام نہ کیا۔ جس موقع پر شرفا نے بھی گالی کو جائز قرار دے رکھا ہو۔ انھوں نے اس موقع سے بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔ کہتے ہیں کہ مجھے گالی سے نفرت ہے۔ انھیں ہر اس بات سے نفرت ہے جس میں بے تکلفی ہو، بے ساختہ پن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی رکھ رکھاؤ کے چکر میں ایسی پھیکی پھیکی سی ہے کہ ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔

انھوں نے ایک واقعہ سُنایا تھا کہ عرصہ ہوا کہ میں جن دنوں گاؤں میں رہتا تھا۔ ماشکی پانی سے مشک بھرے گھر کے سامنے سے گزر گیا۔ ان کے والد نے اُسے گالی دے کر بلایا اور کہا کہ جب تیری مشک میں پانی بھی ہے، گھر کے سامنے گرد بھی موجود ہے تو پھر تُو نے چھڑکاؤ کیوں نہیں کیا؟

ماشکی نے کہا۔ "آپ کا حکم ہو تو —"

ان کے والد نے بات کاٹتے ہوئے فرمایا۔ "تیرے حکم کی —"

یہ سعادت مآب بیٹے بھی کہیں آس پاس ہی کھڑے تھے۔ کہنے لگے "ابا جی گالی نہ دیا کریں"۔ ان کے والد نے احتیاطاً پوچھا "کیوں؟"

ان کا جواب یہ تھا۔ "آپ کی زبان سے گالی اچھی نہیں لگتی۔ وہ دن اور آج کا دن کہ اُنھوں نے اپنے والد صاحب کا بھی بے ساختہ پن چھین لیا۔ صد حیف کہ اس کے بعد اُنھوں نے کسی کو بھی گالی نہ دی۔ والدین اولاد کو سمجھاتے ہیں۔ مگر یہ ایسے سپوت کہ والدین کو نصیحتیں کرتے ہیں۔ شاید کلجگ اسی کو کہتے ہیں۔

بقراطوں کی بھی کئی قسمیں ہیں - اُن میں ایک برانڈ ایسا ہے کہ وہ ہنسا نہیں کرتا - لاکھ ہنسنے کا موقع ہو - مگر وہ ہنسنے کا نہیں ، مبادا کوئی دانت گِن لے - غرض چاہے وہ برانڈ آدم آزار نہ ہو - آدم بیزار ضرور ہوتا ہے -

یہ بھی اپنے وقت کے چھوٹے موٹے بقراط ہیں - یہی وجہ ہے کہ انھیں تنہائی بیحد عزیز ہے - مگر قدرت نے ان کے ساتھ مذاق یہ کیا کہ اُن کے آس پاس آدم زادوں کا جمگھٹا لگا دیا - اِن دنوں یہ جب کہیں بھی پائے گئے - دس بیس آدمیوں کے بیچ میں پائے گئے - وہ بھی ایسے دس بیس آدمیوں کے بیچ ، جو انھیں علامہ کہتے ہیں اور یہ شرماتے نہیں - کیونکہ یہ واقعی علامہ ہیں -

علامہ ان معنوں میں کہ یہ بڑے بڑے علما اور فضلا کی ، علمی اور تحقیقی اغلاط یوں پکڑتے ہیں جیسے وہ اغلاط نامہ ہوں اور یہ تصحیح نامہ !

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ یہ ہنستے کم ہیں - ان دنوں تو یہ اِدھر اُدھر دیکھ کر جھک مار لیتے ہیں - یعنی ہنس لیتے ہیں - پہلے تو مسکراہٹ نام کی چیز سے تو یہ واقف ہی نہ تھے یہی وجہ ہے کہ جب ان کی والدہ نے ان کا پہلی بار قہقہہ سُنا تھا تو بازار سے مٹھائی منگوا کر بانٹی تھی - ہمسائیاں پوچھتی تھیں " بہن مٹھائی کس خوشی میں ؟ "

ان کی والدہ کا جواب ! " بہن آج میرا بیٹا پہلی بار ہنسا ہے "۔

یہ جب اپنے گاؤں سے لاہور آئے تو بھاٹی گیٹ میں آ کر رہے - جو بھاٹی گیٹ میں آ کر بستا ہے وہ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے - کیونکہ میں خود بھاٹی گیٹ کا رہنے والا ہوں - ہمارا جدّی پُشتینی مکان آج بھی محلہ جوگیاں میں موجود ہے -

بھاٹی گیٹ ایک عجیب بازار ہے - یہاں کئی اہلِ علم ، اہلِ قلم اور اہلِ کمال آباد رہے ہیں

یا اُن کا اس بازار سے تعلق رہا۔ حکیم احمد شجاع نے تو اس بازار کو "لاہور کا چیلسی" کہا ہے۔

اس بازار میں علامہ اقبال رہے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، مولانا اصغر روحی، آغا حشر، مولانا ظفر علی خاں، سر عبدالقادر، مولوی عبدالحکیم کلانوری، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، میر ناظم حسین ناظم، سید ممتاز علی، سر شہاب الدین اور پروفیسر محمد سعید دہلوی بھی بھاٹی گیٹ ہی میں سکونت پذیر رہے ہیں۔ تاریخ لاہور کے مصنف سید محمد عبداللطیف بھی اسی بازار میں رہے ہیں۔ آجکل مولانا غلام مرشد بھی اسی بازار میں رہتے ہیں۔ غرض کس کس کا ذکر کیا جائے۔ اگر زندہ ادیبوں کا ذکر تفصیل سے کیا جاسکتا تو میرزا ادیب سے لے کر منظور وزیر آبادی تک، بہت سے ادبا و شعرا کا تذکرہ ناگزیر ہو جاتا۔

جہاں ایسے ایسے اہلِ علم رہے ہوں۔ اُس بازار کی اہمیت واضح ہے۔ اُن سب کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ کل کلاں کو جب اُس بازار میں آباد ہونے والوں کی فہرست مرتب ہو گی تو اس میں اقبال صلاح الدین کا نام بھی آئے گا۔ اس اقبال صلاح الدین کا جس نے اُردو، فارسی اور پنجابی میں متعدد کتابیں لکھیں۔ غالباً اکیس بائیس کتابیں، چھ اُردو میں، چھ پنجابی میں، گیارہ فارسی میں!

آپ غالباً حیران ہوں گے کہ اُنھوں نے کُل تو اکیس کتابیں لکھیں۔ جب اُن کی زبان وار حدبندی کی گئی تو اُن کی تعداد اکیس سے بڑھ گئی۔ آپ کا سوچنا برحق، اس لیے کہ میں کوئی حساب کا سوال تو حل نہیں کر رہا۔

اُنھوں نے فارسی زبان میں جو کتابیں لکھیں۔ وہ زیادہ تر ایڈٹ کی ہیں۔ ایڈٹ بھی

اس شان سے کہ دُنیا بھر کے قدیم ترین اور اہم ترین قلمی نسخوں کی مائیکرو فلمیں منگوائیں۔ اُن کی مدد سے کتابوں کو مکمل کیا۔ ابہام اور اغلاط کو درست کیا اور بعض اغلاط کی قیاسی تصحیح کی۔ یہ کام کوئی آسان کام نہیں۔

کلیات غزلیات خسرو کے پورے چار ہزار صفحات ہیں۔ یعنی جملہ کام چار جلدوں میں؛ جسے پوری دُنیا میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح خسرو کے قصائد کو تین جلدوں میں کلیاتِ قصائد خسرو کے نام سے مرتّب کیا بلکہ اُن پر فاضلانہ دیباچے لکھے جو کہ تقریباً ایک ایک کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً غزلیات پر جو دیباچہ ہے اس کے صفحات ۱۵۷ ہیں اور قصائد پر جو دیباچہ ہے، اس کے صفحات ۱۲۵ ہیں جو کہ فارسی زبان میں لکھے۔

ایسا کام اور اس شان سے کام، وہی شخص کر سکتا ہے جسے قدرت نے غیر معمولی صلاحیتیں دی ہوں۔ وہ جوان کے اُستادِ گرامی نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ اقبال صلاح الدین سمندر ہے اور اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا۔ کچھ غلط نہیں کہا تھا۔

یہ اپنی شکل وصورت کے اعتبار سے ادیب نہیں لگتے۔ جیسے مولانا غلام رسول مہر ادیب نہیں لگتے تھے۔ وہ گفتگو بھی کرتے تھے تو ایسی "تیں کی کہیا" مگر علم ان کے پاس اتنا فالتو تھا کہ خرچ کیے گھٹتا نہ تھا۔ یہی حال ان کا ہے۔

چونکہ یہ بنیادی طور پر زمیندار ہیں۔ اس لیے ان کے چہرے مہرے سے بھی زمینداریت ہی ٹپکتی ہے۔ یہ اُن لوگوں میں سے نہیں کہ جو گھر سے تو لے کر چلے ہوں زمینداریت، مگر جب شہر سے گاؤں لوٹے ہوں تو گرہ میں زمینداریت ہو نہ شہریت! یعنی ان میں نہ گاؤں کی معصومیتیں ہوں اور نہ شہر کی چلتر بازیاں!

یہ جب گاؤں میں رہے بھینسیں چراتے رہے۔ بھینسیں اُنھوں نے کسی ہیر کے فراق میں نہیں چرائیں۔ بلکہ ماحول کے تقاضوں کی خاطر، اگر وہاں معاملہ عشق کا تھا تو یہاں فرائض کا، یعنی اُنھوں نے اپنے لیے فرائض کا انتخاب بھی کیا تو اُن فرائض کا جن میں قطعاً کوئی دلکشی نہ تھی۔ اب کوئی ایسے ٹھس آدمی کو کہاں رکھے۔ کہاں چھپائے؟

عرض کر چکا ہوں کہ یہ فطرتاً خاموش طبع ہیں۔ چُپ اور چپ شاہ، زیادہ بولنے کو اسراف بے جا میں سے سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو بہت بولتے ہیں، اُن سے مل کر یہ زیادہ خوش نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود ہم مذاق دوست بیٹھے ہوں تو یہ چہل بازی سے باز نہیں آتے۔ غرض طبیعت رواں ہو تو گفتگو لطف انگیز ہوتی ہے۔

عموماً میری میز پہ کاغذوں کے انبار کے ساتھ کتابیں بھی پڑی رہتی ہیں۔ وہ اس لیے کہ میرے پاس جو نئی کتاب آتی ہے اُسے میں میز پر سے اس لیے نہیں ہٹاتا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دوستوں کی نظر سے گزر جائے۔ یوں کوئی کتاب دس پندرہ دن تک پڑی رہتی ہے، کوئی مہینہ بھر تک۔ اس کے بعد اُٹھا کے سنبھال لیتا ہوں یا اس کے اصل مقام تک پہنچا دیتا ہوں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک کتاب کو زیادہ عرصے تک رکھے دیکھا تو پوچھا۔ کیا اس کتاب کی "عدت" کے دن ختم نہیں ہوئے؟

اسی طرح ان کے ایک دوست ہیں۔ جن کی شادی خاصی پختہ عمر میں جا کر ہوئی۔ بظاہر نقشہ یہ تھا کہ چار پانچ بچوں کے باپ دِکھتے تھے۔

چنانچہ اسی مغالطے میں ایک صاحب نے اُن سے سوال کر ڈالا "آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

موصوف نے جواب دیا "ابھی تو میری شادی نہیں ہوئی"

سوال کرنے والے صاحب بھونچکارہ گئے۔ اس پر اقبال صلاح الدین کا تبصرہ۔

"یہ اس معاملے میں "خود کفیل" تھے۔"

یہ واقعی عام لوگوں سے الگ سے انسان ہیں۔ چاہتے ہیں کہ کوئی غلطی کرے تو اس کا اقرار بھی کرے۔ یعنی جھوٹ بولے تو کہے کہ میں جھوٹا ہوں۔ کوئی بدمعاملہ ہو تو کہے کہ میں بدمعاملہ ہوں۔ کوئی ادبی چوری کرے تو کہے، میں چور ہوں۔ یہ اچھی زبردستی ہے۔ مگر ہے۔ یعنی ان کے ہاں دوستانہ، ادیبانہ یا شریفانہ گناہ کی گنجائش ہی نہیں۔

یہ بعض اوقات ذراسی بات پر آزردہ ہوجاتے ہیں اور پہاڑ جیسی بات کو رائی برابر سمجھتے ہیں۔ دل میں اتنا کھلا صحن رکھا ہوا ہے کہ کوئی کتنی ہی بڑی زیادتی کیوں نہ کرے۔ یہ اُسے دل کے صحن میں ڈال کے بھول جائیں گے۔ اس معاملے میں یہ بہت بڑے ذخیرہ اندوز ہیں۔

جس طرح یہ دوسروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ غلطی کرے تو اس کا اعلان بھی کرے۔ اُسی فارمولے کے تحت یہ اپنے بارے میں بھی اپنی غلطیوں کے اعلانات کرتے رہتے ہیں۔ اسے آپ ان کی خوبی کہہ لیں یا خامی مگر یہ ہے دل گردے کی بات! جس میں بڑائی کا پہلو تو بے شک ہے مگر منافقت کا پہلو کوئی نہیں۔

جن منافقوں کے بارے میں فیصلہ کر لیتے ہیں کہ زندگی بھر نہ ملیں گے۔ وہ اگر خود ان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں تو ان کے جملہ گلے شکوے ختم، اپنے بدترین دشمنوں کے بارے میں بھی، اُن کی بدخوئی سُن کر خوش نہیں ہوتے۔ بلکہ ٹوکتے ہیں۔ یہ قائل ہے۔ یعنی دشمنی میں بھی فیئر گیم ہونی چاہیے۔

دشمنوں سے ٹھیس پہنچے گی تو اس کا اظہار فوراً نہ کریں گے۔ بلکہ دشمن کو ڈھیل دیں

گے تاکہ وہ اپنے ارمان نکال سکے اور بہ خود ہنس سکیں۔ لیکن اگر انھیں دوستوں سے شکایت ہو گی تو اس کا اظہار فوراً کریں گے تاکہ بدگمانی جلد سے جلد دُور ہو۔ یہ دشمنی میں تو شرک کے قائل ہیں۔ دوستی میں نہیں۔

اُدھر ان کی عمر کو دیکھا جائے۔ اِدھر ان کی صحت کو، تو یہ اچھے خاصے توانا آدمی ہیں۔ لیکن کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس دن یہ کوئی نہ کوئی دوائی کھاتے نہ پکڑے گئے ہوں۔ یہ رویّہ علالتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ وہم کی وجہ سے ہے۔ یا بہ سلسلہ حکمت، شوقِ فراواں کا!

ڈامن کی گولیاں، ان کے دائیں بائیں درازوں میں پڑی رہتی ہیں۔ دوستوں کو یہ راز معلوم ہے۔ چنانچہ وہ ان کی اجازت کے بغیر، اپنی صحت ٹھیک کرتے رہتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر، ان کا حکیموں اور ڈاکٹروں سے رشتہ، کچھ ازلی ٹائپ کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس متعدد قسم کے جان لیوا اور جان بچاؤ نسخے موجود ہیں۔ جیسی ضرورت ہو ویسا نسخہ حاضر کر سکتے ہیں۔ جس طرح ادب میں کتابوں کے ڈھیر لگائے ہیں۔ مریضوں کے بھی ڈھیر لگا سکتے ہیں۔

ان کے اپنے دوستوں سے خلوص کے رشتے استوار ہیں۔ ادب و شعر کے معاملے میں، اُن کی حیثیت بڑی ہو یا چھوٹی، برابری کی بنیاد پر ملتے ہیں۔ برابری کی بنیادوں کو صرف وہاں کھسکاتے ہیں۔ جہاں کوئی حاجت مند سامنے آجائے۔ یہ دوسروں کی مدد کر کے اور اپنا ستیاناس کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔

اپنی شرافتِ طبع کی وجہ سے مالی نقصان اُٹھاتے رہتے ہیں۔ بلکہ جن دوستوں سے رقم لینا ہوتی ہے۔ اُن سے وصول کرنے کا سلیقہ نہیں جانتے۔

ایک دن، ان کے ایک دوست نے انھیں چھیڑا۔ آپ تو ایسے دلچسپ آدمی ہیں کہ کسی کو ادیب ہی نہیں مانتے۔ ہر ایک کے کام میں نقص نکالتے رہتے ہیں۔

"مانتا کیوں نہیں! میں حالی سے متاثر ہوں۔ کیوں کہ وہ مکمل ادیب اور مکمل انسان ہے۔ ادیب وہ، شاعر وہ، سوانح نگار وہ، نقّاد وہ، غرض بہ حیثیت ادیب وہ کون سی خوبی تھی جو حالی میں نہ تھی۔

"آخر اتنے ادیبوں اور شاعروں میں حالی ہی کیوں پسند؟" دوست نے چھیڑا

ان کا جواب یہ تھا "وہ بھی چپ چاپ، کمزور اور دُکھی طبیعت کا مالک تھا شاید اس لیے!" دوسرے یہ بھی کہا "حالی نے نئے راستے دکھائے، نئے سلیقے دیے۔ خاص طور پر نئے شعور، اگر حالی نہ ہوتا تو شاید اقبال بھی نہ ہوتا۔ حالی کے بعد اقبال سے متاثر ہوں۔ اقبال کو جتنی بار بھی پڑھا، نیا لطف ملا۔ نئی راہیں کُھلیں، پھر سکون ملتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے مجھے قرآن پاک کے مطالعہ سے سکون ملتا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ لوگوں نے خسرو کو نہیں پڑھا۔ بہ حیثیت شاعر اور ادیب وہ اتنا ضخیم ہے کہ پڑھنے کے لیے عمر چاہیے۔ غزلیں اور مثنویاں سامنے آئیں مگر نامکمل صورت میں، خسرو کی اصل قیمت فنی اور فکری اعتبار سے قصائد میں ہے۔ پھر خسرو دنیائے ادب کا پہلا نقّاد ہے۔ جس نے اپنے فن پر بھرپور تنقیدی نظر ڈالی۔

اِن میں دوستوں کے چہرے پڑھنے کا سلیقہ ہے۔ خاص طور پر کسی ایسے دوست کا چہرہ کہ جو ضرورت مند ہو۔ بجائے اس کے کہ ضرورت مند اپنی ضرورت کا حال بیان کرے۔ یہ خود اس سے پوچھ لیں گے۔ منہ لٹکا ہوا ہے۔ خیریت تو ہے؟ غرض حسبِ توفیق کسی کو بھی مایوس نہیں کریں گے۔

لکھنے پڑھنے سے انھیں عشق ہے۔ باپ انھیں انجنیئر بنانا چاہتے تھے۔ مگر یہ انجنیئر بننے ادب کے، اس عشق کی پاداش میں، انھیں مالی چرکے لگے۔ لیکن انھوں نے نہ کسی سے گلہ کیا نہ شکوہ، ان کا تقرر بہ حیثیت لیکچرار ہو سکتا تھا۔ مگر یہ راضی نہ ہوئے۔ مٹی جو ادب کی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اگر میں کسی کالج میں لیکچرار ہو جاتا تو بے شک مالی آسودگی حاصل ہوتی۔ لیکن لکھنے پڑھنے کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ تنگ دستی میں کبھی کبھی پچھتاؤں نے بھی آن گھیرا۔ لیکن ان کے ضمیر کا آخری فیصلہ یہی رہا کہ جو فیصلہ کیا تھا۔ وہی درست تھا۔

مجھے اس بات کی بڑی ٹوہ رہتی ہے کہ معلوم کروں کہ جس شخص کے بارے میں مضمون لکھ رہا ہوں۔ وہ مکمل انسان ہے کہ نہیں۔ یعنی اس نے محبّت بھی کی ہے کہ نہیں۔ اگر وہ خانہ خالی ہوتا ہے تو مجھے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

محبّت کرنا کوئی بُری بات نہیں۔ معرفت میں چلے جائیے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رسولؐ نے خدا سے محبّت کی اور رسول سے خلقِ خدا نے!

اگر محبّت سے مراد شدید جذباتی لگاؤ بھی ہو، تو بھی میرے نزدیک یہ جذبہ قابلِ احترام ہے۔ بشرطیکہ معاملات میں ایک شائستگی ہو۔ ایک رکھ رکھاؤ ہو۔ یعنی ماجھے ساجھے کی محبّت نہ ہو بلکہ علاّمہ اقبال کی محبّت ہو۔ شبلی نعمانی کی محبّت ہو۔

میں نے اقبال صلاح الدین کا افسانہ "کونج کہانی" پڑھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس میں حنیف کا جو کردار ہے جیسے وہ اپنے اقبال صلاح کا ہو۔ اس افسانے میں سنار کی بیٹی حنیف سے لپٹ جاتی ہے۔ لپٹ کا لفظ میں نے عملی معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ بلکہ محاورتاً، بہر حال وہ نیوندرا کچھ ایسا بابرکت ثابت ہوا کہ پھر تو حنیف کی زندگی میں رانی بھی آئی۔ ایمان بھی آئی۔ اصغری بھی آئی۔ سلمٰی بھی آئی۔ یہ سب کی سب

جذباتی میدان میں کود پڑیں ـ جیسے سسّی، ہیر اور صاحباں کود‌ی تھیں۔ بہرحال اتنی ڈھیر ساری ٹیاروں میں سے ایک ٹیار سلمٰی نامی ان کی زندگی میں داخل ہو گئی ۔

قصّہ مختصر! آج حنیف کی شادی کو پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ یہ آج بھی تمانے کے تمانے ہیں ۔ انھیں بے شک مسرتیں حاصل ہیں۔ لیکن ان کے من کی دُنیا پہلے سے زیادہ اُجڑی پُجڑی ہے ۔ یہ سلمٰی کو چھوڑ تو نہیں سکتے۔ اس کے باوجود رانی، ایماں اور اصغری کی یادوں کو بھلا نہ سکے ۔ یہ شخص آج بھی سلمٰی سے زیادہ وقت، اُن بچھڑی ہوئی روحوں کے ساتھ گزارتا ہے ۔

آپ کو معلوم ہے کہ محبّت کرنے والوں پہ خدا کا سایہ ہوتا ہے ؟

قتیل صاحب

میں نے بڑے بڑے جغادری ادیبوں پر مضامین لکھے مگر قلم پر کبھی کپکپی طاری نہ ہوئی ۔ مگر قتیل ایک ایسا شخص ہے جس پر لکھتے ہوئے دل گھبراتا ہے ۔ سوچتا ہوں نہ جانے وہ میری کس اچھی بات پر خفا ہو جائے اور جانے کس بُری بات پر خوش ہو کر ونس مور کہہ دے ۔ ایسا تذبذب کیوں ؟ آدمی موج کا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میں تعلقات کا بھرم رکھنے کے لیے جملہ انواع و اقسام کی باتیں چھیڑوں گا ۔ یعنی تلخ ، تُرش ، شیریں ! زندگی کے ابتدائی برسوں میں ، مَیں جن شاعروں اور ادیبوں سے مِلا ۔ اُن میں قتیل کا نام آتا ہے ۔ اگر میں یہ کہوں کہ لڑکپن کے اُس دَور میں صرف دس بیس ادیبوں ہی سے ملاقی تھا تو یہ سچ ہو گا ۔

نہ جانے وہ کون سی تقریب تھی کہ میں ہری پور ہزارہ جا نکلا ۔ وہاں قتیل صاحب سے ملاقات ہُوئی ۔ وہ دن اور آج کا دن کہ ہم ایک دُوسرے کو اچھا سمجھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں ۔ یہ تعلقات کی نوعیت جیسی بھی ہو ، ہے چاق و چوبند ۔ بہر حال تعلقات کی ایسی عجیب سی نوعیت کے باوجود ہم دُور دُور نہ رہ سکے ۔ ویسے یہ مسئلہ الگ ہے کہ کبھی کبھی ہم بلا وجہ ہی ایک دُوسرے کو گھُورتے ہیں ۔ موقع ملے تو

یہ تاثر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے کہ آپ پڑوسن لڑیں! اس کے باوجود میرا گمان یہ ہے
جیسے انھیں میری ضرورت ہو اور مجھے ان کی۔ جیسے ہم دریا کے دو کنارے ہوں۔ جو
رہیں گے دو ہی اور ان دو کناروں کے درمیان جو دریا بہہ رہا ہو، وہ دوستی کا دریا ہو۔
ہر شخص اپنے آپ کو عقلِ کُل کا مالک اور شائستگی کا منبع سمجھتا ہے۔ الحمد للہ کہ
بندہ بھی اپنے آپ کو ایک ایسا ہی شخص سمجھتا ہے۔ قتیل صاحب کے بارے میں بھی میرا ایسا
خیال ہو سکتا تھا۔ بشرطیکہ یہ پٹھان نہ ہوتے۔

اصل میں ان میں جتنی خرابیاں یا اچھائیاں ہیں، وہ ان کے پٹھان ہونے کی وجہ
سے ہیں۔ میں نے لُغت میں پٹھان کے معنی دیکھے۔ وہاں یہ لکھا تھا۔ سپاہی، خونخوار
اور لڑاکا۔ اس سے زیادہ میں قتیل صاحب کی تعریف کیا کروں؟ ویسے اگر میں
صاحبِ لُغات کی رائے کو نہ مانوں اور ایماناً ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار
کروں تو وہ کچھ ایسی ہوگی کہ ان کی سپاہیت میں، ان کی خونخواریت اور ان کی لڑاکیت
میں ایک توازن ضرور ہے۔ فن کارانہ توازن۔

پہلے میں نے آپ کو لفظ پٹھان کے معنی بتائے۔ اب ایک محاورہ بھی سُن لیجیے
لُغت میں لکھا ہے کہ "پٹھان کا پوت گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت!" نہ جانے اہلِ لُغت
پٹھانوں کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر میں نے کوئی لُغت ترتیب دی تو میں
پٹھان کے معنی بدلوں گا۔ اسی طرح محاورے کو بھی ٹھیک ٹھاک کروں گا۔ اگر ٹھیک نہ
کر سکا تو ٹھاک تو کر ہی دوں گا۔

اب آئیے اُس ماحول کو ٹٹولیں کہ جس شہر میں، یہ پلے اور بڑھے۔ وہ علاقہ
اَدبی اعتبار سے بنجر تھا۔ کچھ بابو ٹائپ کے لوگ تو تھے مگر ادب کے نام سے کوئی

واقف نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صاحب نے جب ان سے مشاعرہ کا لفظ سُنا تو پوچھا۔
نوشہرہ تو میں گیا ہوں۔ مشاعرہ کہاں واقع ہے ؟

ہری پور میں جو پہلا مشاعرہ ہوا۔ وہ انہی کے دم سے ہُوا۔ وہ مشاعرہ ۱۹۴۰ء میں یوم اقبال کے سلسلے میں ہوا تھا۔ اس کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ جب ایک دوکاندار سے مشاعرہ کے لیے چندہ مانگا اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ مشاعرہ ڈاکٹر اقبال کی برسی کے موقع پر ہوگا تو دوکاندار نے آبدیدہ ہو کر پوچھا۔ "اچھا، ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا ؟"

ہاں ہاں! یہی وجہ ہے کہ اُن کی برسی پر مشاعرہ ہو رہا ہے۔ دوسرے لوگوں نے تو ایک ایک دو دو روپے بطور چندہ دیے مگر اُس دوکان دار نے پانچ روپے دیے۔ ساتھ ہی یہ کہا "ڈاکٹر صاحب بڑے قابل انسان تھے۔"

قتیل صاحب اس تبصرے پر خاصے خُوش ہوئے۔ پوچھا "آپ تو ڈاکٹر صاحب کے کام اور نام سے واقف نکلے۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔"

"بہت خُوب!"

"میری بھینس بیمار ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت سے علاج کیا تھا۔"

بے شک اس واقعہ پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ماحول تھا یہ، جس میں قتیل صاحب پروان چڑھے، مگر اُنھوں نے آہستہ آہستہ وہاں کے ادبی ماحول کو بدلا۔ اب وہاں کے لوگوں کو معلوم ہے کہ مشاعرہ کِسے کہتے ہیں اور نوشہرہ کِسے، اور معلوم یہ بھی ہے کہ ادب کسی شخص کا نام نہیں بلکہ ادب اُس کو کہتے ہیں کہ جو آدمی کو انسان بناتا ہے۔

مشہور ہے کہ یہ دوستوں کے دوست ہیں اور دشمنوں کے دشمن، پھر دوست بھی سیانے، دشمن بھی سیانے، شاید یہی وجہ ہے کہ میرے دشمن ہیں۔ میرا ان سے واسطہ نادان دوست والا نہیں دانا دشمن والا ہے۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ یہ مجھے دانا دوست اور نادان دشمن سمجھتے ہوں۔ قصّہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے میں غلطی ہوئی اور یہ غلطی ہم مسلسل چالیس برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دوستی کی اس اجنبیت پر قدرت بھی حیران ہے۔ اس لیے کہ ہم نے قدرت کے مسلّمہ ضابطوں میں رخنہ ڈال رکھا ہے۔

یہ صاف گو ہیں۔ اتنے صاف گو کہ بعض اوقات ان پہ مُنہ پھٹ ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ جو شخص صاف" نہیں" نہ کہہ سکتا ہو اس کے بارے میں یہ یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس کی سیرت ناقص اور خُلق ناتوان ہے۔ یہ صاف گو ہوں یا مُنہ پھٹ، ان کی سیرت ناقص اور ناتوان نہیں ہے۔

قتیل صاحب بڑے فقرے باز ہیں۔ بڑے کٹیلے فقرے کستے ہیں۔ پھر اُن میں نہ صرف کٹیلا پن ہوتا ہے بلکہ لطافت بھی ہوتی ہے۔ اس باب میں ایک دو باتیں ہو جائیں۔

جن دنوں قتیل صاحب مجھ سے خفا تھے۔ میں نے انھیں کہا "کسی دن آئیے کہ آپ کو چرغا کھلایا جائے"

کہنے لگے "اب آپ کا چرغا ہضم نہ ہوگا"

فارغ بخاری صاحب سے ان کی دوستی حد درجہ کی ہے۔ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں سما گئی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک دوسرے کے بارے میں بڑی بے تکلّفی

سے گفتگو کرتے ہیں، چنانچہ فارغ صاحب کا یہ فقرہ بھی اُسی کھاتہ میں سے ہے۔ وہ یہ کہ "قتیل جس کے پیچھے پڑجاتا ہے۔ اُسے قبر تک معاف نہیں کرتا" یہ فقرہ کوئی اور لکھ دیتا تو قتیل صاحب آپے سے باہر ہوجاتے۔ چونکہ معاملہ دوستی کا تھا اس لیے یہ فقرہ بھی پی گئے۔

چونکہ دوستی ہے۔ اس لیے چہلیں یہ بھی کریں گے۔ فارغ بخاری صاحب باتھ رُوم میں جاتے ہیں تو خاصی دیر لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسے ہی موقع پر احمد ندیم قاسمی کی قتیل صاحب کے ساتھ مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی :

احمد ندیم "؛ فارغ صاحب غُسل خانے میں جاتے ہیں تو نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے"۔

قتیل : "وہ ایسا ہی کرتے ہیں"۔

"کیوں ؟"

" وہ کام جس کا سب کو علم ہے۔ وہ تو کرتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کرتے ہیں"۔

" مثلاً، مثلاً !"

" مثلاً وہ بالوں کو خضاب بھی غُسل خانے ہی میں لگاتے ہیں"۔

اتنے میں فارغ صاحب غسل خانے سے نکلے اور اُنھوں نے چھُوٹتے ہی کہا

"قتیل تُو ہر وقت میری بُرائیاں کرتا رہتا ہے۔ باز آجا !"

قتیل صاحب نے کہا " میں نے تو کوئی بُرائی نہیں کی"۔

فارغ : "میں سب سُن رہا تھا"۔

قتیل "؛ میں نے تو صرف بالوں کو خضاب لگانے کا ذکر کیا تھا۔ اصل بات تو بتائی ہی نہیں کہ تیرے سارے دانت بھی مصنوعی ہیں"۔

جس دوست نے قتیل صاحب سے میرا تعارف کرایا تھا۔ وہ بچّوں کے ادب میں اچھی خاصی شہرت رکھتے تھے۔ انہی کی وجہ سے میرا ادیبوں سے ملنا جُلنا ہُوا تھا۔ پھر اُسی متذکرہ شخصیت کے اشتراک سے میں نے پبلشنگ ہاؤس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ مگر وہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ اُس اشتراک میں جو حصّہ ملا۔ وہ یہ ایک جملہ تھا "طفیل ایک نالائق شخص ہے۔ جو کچھ ہوں، وہ میں ہوں"۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے" کہ جو کچھ ہوں۔ وہ میں ہوں"۔ مجھے اس سوچ پر کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ بلکہ سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ جب کوئی دوست یہ کہتا ہے کہ مَیں نالائق ہوں تو دُکھ ہوتا ہے۔ میری نفی کے ساتھ، قدرت کی عنایتوں کو بھی جھٹلایا جاتا ہے۔ اُس وقت میری سوئی ہوئی اَنا بیدار ہوتی ہے۔ تب میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے سلسلے میں حائل پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کرنے کی ٹھان سکتا ہوں۔ مگر احتیاط اتنی کرتا ہوں کہ اوچھے ہتھیار استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ صبر اور استقامت کی پونجی کو خرچ کرنا شروع کر دیتا ہوں۔ وہی مندرج طعنہ آمیز کلمہ، میرے لیے ادب کی وادیوں میں کُودنے کا سبب ہُوا۔ اور وہی طعنہ آمیز کلمہ قتیل صاحب سے جنگ چھڑنے کا!

قتیل صاحب سے جنگ چھڑنے کی تلمیح، رائٹرز گلڈ کے الیکشن ہیں۔ قتیل صاحب مجھ سے ہار کر سُرخرو ہو گئے۔ میں جیت کر اس میں لت پت ہو گیا۔ سارے ادبی کام چھُوٹ گئے۔ اِن ایک دو جملوں کے علاوہ میں اس موضوع پر کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

قتیل صاحب کو الیکشن لڑنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ پہلا الیکشن اُنھوں نے

اس وقت لڑا جب یہ چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔ الیکشن لڑنے سے پہلے یہ کلاس میں سب سے ہونہار طالب علم تھے۔ الیکشن کے بعد آٹھویں نویں نمبر پر آ گئے۔

چونکہ الیکشن لڑنے کا تجربہ انھیں بچپن سے تھا۔ اس لیے ادیبوں کی تنظیم رائٹرز گلڈ کے بھی اُنھوں نے الیکشن لڑے۔ کسی کو بھی دس بارہ برس تک، پاس پھٹکنے نہ دیا۔ ہم نے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو ان کے حق میں دستبردار ہوتے دیکھا۔

مشاہدہ میں آیا ہے کہ جو دوست الیکشن ہار جاتے ہیں۔ وہ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ مگر آفرین ہے قتیل صاحب پر کہ جب مقبولیت کی بازی کا فیصلہ ہو گیا تو اُنھوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی پریشان نہ کیا۔ میں قتیل صاحب کے اس وصف پر اگر خطِ غلامی نہیں تو خطِ محبّت لکھنے کے لیے ضرور آمادہ ہوں۔

قتیل صاحب کا دستر خوان بڑا وسیع ہے۔ مطلب یہ کہ وہ پیروں کی طرح صرف کھانا ہی نہیں جانتے بلکہ مُریدوں کی طرح کھلانا بھی جانتے ہیں۔ ویسے رسم تو یہ ہے کہ اپنے سے بڑوں کی دعوت کرو اور خوشنودی حاصل کرو۔ مگر یہ اپنے برابر کے دوستوں کو بھی نوازتے ہیں یا دوستیوں کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف بیرونِ لاہور کے دوستوں کی دعوتیں کرتے ہیں بلکہ مقامی دوستوں کو بھی اکٹھا کرتے رہتے ہیں۔ یعنی مل بیٹھنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ کھاؤ یا کھلاؤ ان کا روز مرّہ ہے!

ذوق بھی عمدہ پایا ہے۔ اچھا کھانا ان کی کمزوری ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ نہاری کس جگہ اچھی ملتی ہے۔ کباب کہاں اچھے بنتے ہیں، کھیر کس دُکان کی اور چرغا کہاں کا مشہور ہے۔ غرض یہ بڑے چسکے کے آدمی ہیں۔ یعنی یہ چسکے اور چُسکی دونوں ہی طرح کے آدمی ہیں۔ ایک دروازہ تو ان پہ بند ہو چکا ہے۔ البتہ دوسرا دروازہ ابھی کھُلا ہے یعنی چسکے والا!

قتیل صاحب نے ایک دفعہ کہا تھا کہ مجھے مہمانوں کی آمد سے خوشی ہوتی ہے۔ بیوی بھی اٹھلاتی پھرتی ہیں۔ کوئی مہمان نہ ہو تو گھر اُجڑا اُجڑا سا لگتا ہے۔

مجھے فارغ بخاری صاحب نے بتایا یا کسی اور نے کہ ایک زمانہ میں کہ جب ان کی فاقہ مستی کے دن تھے۔ مقروض بھی تھے کہ فارغ صاحب ہری پور ہزارہ پہنچے۔ ادھر ان کی جیب خالی، قرض دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ خاصے پریشان ہوئے۔

اُنھوں نے جب دیکھا کہ چند روپے بھی کہیں سے میسّر نہ آسکیں گے تو انھوں نے رسالوں کی فائیلیں ردّی میں بیچ دیں۔ وہ رسالے جو اُنھوں نے بڑے چاؤ سے اکٹھے کر رکھے تھے۔ ردّی میں بِک گئے۔ ذہن کی دُنیا لُٹ گئی۔ دل کی دُنیا آباد ہو گئی۔

قتیل صاحب شاعری کے ماتھے کا جھُومر ہیں۔ توقع ہے کہ تحریر کی دُنیا میں ایک لمبے عرصہ تک یاد رکھے جائیں گے۔ غزل اور گیت ان کا خاص میدان ہے۔ ان دو شعری میلانوں کے علاوہ، ان کی دھاک ایک اور فیلڈ میں بھی ہے اور وہ ہے فلمی شاعری، جسے انھوں نے ادبی شاعری کے قریب تر کر دیا۔ بعض نامور شاعر فلمی شاعری کی طرف گئے تو اُس میں غرق ہی ہو گئے۔ پھر اُن کا ادب میں سراغ نہ ملا۔ مگر یہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے ان دونوں جہتوں کا حق ادا کیا۔ بلکہ فلمی گیتوں کو بھی مشرف بہ ادب کیا۔

فلمی دُنیا میں انھیں پہلے پہل محبوب اختر لائے جو ہندوستان کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ محبوب اختر پاکستان آکر اپنے جوہر دکھا نہ سکے مگر قتیل صاحب خُوب چلے اور خُوب چمکے۔ ریڈیو جب بھی سنیں گے کسی نہ کسی اسٹیشن سے ان کے نغمے براڈ کاسٹ ہو رہے ہوں گے۔ اِس میدان میں ان کی مقبولیت ادبی دُنیا سے کچھ زیادہ ہی ہے مگر یہ مسئلہ وقتی ہے۔ دائمی زندگی ان کے نام سے چھپے ہوئے اکھرّوں ہی کی بدولت ملے گی۔

یہ فلم میں روزگار کی خاطر گئے تھے تاکہ ادب کی طرف بے فکری کے ساتھ رجوع کیا جا سکے۔ فلم لائن اختیار کرنے سے پہلے ان کا صرف ایک مجموعہ "ہریالی" منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد جتنے بھی مجموعے سامنے آئے وہ فلم انڈسٹری میں داخل ہونے کے بعد ہی آئے۔

غرض یہ روزگار کی خاطر، بھٹکنے والی عمر کا سارا حصہ فلمی دنیا میں گزار آئے۔ عورت زدگی کی بجائے عورت نگاری کرتے رہے۔ ناگاہ جہاں دل حادی ہو گیا وہاں انھوں نے تدبیر کی چادر ڈال دی۔ بے شک وہاں ترغیب اور پھسلنے کے سیکڑوں مواقع تھے مگر یہ زیادہ تر دامن کشاں رہے۔ اگر کہیں ڈولے بھی تو ہوش مندی کے ساتھ، سنبھلے بھی تو سود و زیاں کی تمیز کی بدولت، غرض چھینٹے بہت اُڑے۔ داغ بھی خاصے لگے مگر اس صاحبِ تدبیر انسان نے گھر کے ماحول کو پُرسکون رکھنے کے لیے خاصے جتن کیے۔

پچھلے دنوں قتیل صاحب ہندوستان گئے تھے محض سیر و تفریح کی خاطر، سب مجھے معلوم ہوا کہ وہاں کی فلم انڈسٹری میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے جیسے نورتنوں میں سے کوئی ایک رتن ان کے پاس پہنچ گیا ہو۔

چند دوست جو ادب کے میدان میں ان کے رفیق تھے وہ انھیں اپنے ہاں پاکر اور ان کی پذیرائی کو دیکھ کر پہلے تو ٹھٹھک گئے۔ اس کے بعد بھٹک گئے جب کاروباری بدگمانیاں بڑھنے لگیں تو یہ چپکے سے حسبِ پروگرام واپس آ گئے۔

قتیل صاحب نہیں چاہتے کہ ان کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ، بہ سلسلہ فلم ہو۔ وہ ادب کے طالب علم بن کر اُبھرنا چاہتے ہیں۔ وہ ادب کے خادم بن کر زندہ رہنا چاہتے

ہیں۔ وہ ادب کی راہوں میں اپنی خوشبو قائم رکھ کر سُرخرو ہونا چاہتے ہیں۔

قتیل صاحب دُشمنیاں ہی نہیں پالتے، دوستیاں بھی پالتے ہیں۔ دوستیاں پالنے کا جذبہ ان کی شخصیت میں بہت نمایاں ہے۔ ان کے جو دوست ہیں وہ ان کے نزدیک ہر طرح کی طرفداری کے مستحق ہیں۔ جھوٹے ہوں تو، سچّے ہوں تو۔

خلافِ مزاج کسی بات کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مصلحت آمیز سمجھوتے ان کی زندگی سے یکسر خارج ہیں۔ عرصے کی بات ہے کہ یہ ریڈیو کے کسی افسر سے ناراض ہو گئے۔ باقاعدہ ٹھن گئی۔ قتیل صاحب نے باقاعدہ تحریک چلا دی کہ ادیب ریڈیو کا بائیکاٹ کریں۔ لاہور کے بیشتر ادیبوں نے قتیل صاحب کا ساتھ دیا۔ اشتہارات چھاپے گئے۔ پوسٹر نکالے گئے۔ اخباروں میں لکھا لکھایا گیا۔ بات افسرانِ بالا تک پہنچی۔ بالآخر اس افسر کو تبدیل کرایا۔ تب قتیل صاحب نے اپنے دوستوں میں بیٹھ کر انکشاف کیا۔ میں تو اس کی جدِ پشت کو تبدیل کرا دیتا۔

میرے ایک دوست کا خیال ہے کہ میاں بیوی میں، کم از کم بھی سال میں ایک دو جھڑپیں ضرور ہونی چاہییں۔ ضرور ایک دوسرے کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھنا چاہیے۔ اگر یہ کچھ نہ ہو تو زندگی بے کیف ہو جائے۔ جینے کا لُطف جاتا رہے۔ تجدیدِ محبّت کے امکانات ختم ہو جائیں۔

میرا خیال ہے کہ اس فارمولے پر قتیل صاحب بھی عمل پیرا ہیں۔ بیوی میاں سے ڈرتی ہے، میاں بیوی سے، جس لمحے دونوں ایک دوسرے سے نہیں ڈرتے تو اُس لمحے کچھ ہو ہوا کے تجدیدِ محبّت کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

میں نے ایک دن بھابی سے پوچھا "آپ کیوں قتیل صاحب سے لڑتی ہیں؟"

"میں کہاں لڑتی ہوں، لڑتے تو وہ ہیں"

"اچھا!"

"مگر یہ آپ کو بتایا کس نے؟"

"بتانا کس نے ہے۔ یہ سوال وہ ہے کہ جو ہر میاں بیوی کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ سوال بھی یونیورسل ہے اور جواب بھی!

قتیل صاحب کی جزئیات پر بڑی نگاہ رہتی ہے۔ وہ آپ کو دیکھیں گے تو فوراً یہ تک جان سکیں گے کہ آپ کی قمیص میں کتنے بٹن لگے ہیں یا آپ کے جوتے کا تسمہ ٹوٹا ہوا ہے یا ٹھیک ہے یا یہ کہ آپ کی مونچھوں میں کتنے بال سفید ہیں اور کتنے کالے!

پھر ان کا دماغ بڑا حاضر ہے۔ وہ آپ کو آج سے بیس برس پہلے کی ملاقات کا تفصیلی حال بتا سکتے ہیں۔ جتنی باتیں ہوئی ہوں گی، اُن کی ذرا ذرا سی تفصیل بھی ان کے ذہن سے باہر نہ ہو گی۔

قتیل صاحب تو جزئیات پر دسترس اور اس نوع کی حاضر دماغی کی تردید ہی کریں گے۔ کہیں گے کہ مجھے تو اشعار تک یاد نہیں رہتے۔ لیکن شخصی میل جول میں، ان کی یادداشتیں حیران کن ہوتی ہیں۔

میں نے قتیل صاحب سے دریافت کیا۔ صدر ایوب کے زمانے میں یہ مشہور ہوا تھا کہ حکومت نے آپ کو سرکاری طور پر نوازا تھا۔ موتیوں سے مُنہ بھر دیا تھا۔ کہنے لگے سب افواہیں ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ جب میں رائٹرز گلڈ کا ریجنل سیکرٹری تھا تو انعامات کی ایک تقریب میں صدر ایوب سے ملاقات ہوئی تھی۔ گلڈ کے سیکرٹری جنرل قدرت اللہ شہاب نے صدر سے میرا تعارف یوں کرایا تھا۔ یہ بھی آپ کے ہم شہر ہیں یعنی ہری پور ہزارہ کے!

اس پر صدر نے کہا تھا "کوئی خدمت بتائیے!"

جواب میں مَیں نے کہا تھا کہ میں اس بات پر خوش ہوں کہ آپ مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ساتھ ہی میں نے رائٹرز کالونی کی درخواست صدر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی تھی کہ ادیبوں کا کچھ کیجیے۔ انھوں نے وہ درخواست شہاب صاحب کو دے دی تھی۔ شہاب صاحب نے گورنر صاحب کو بھجوا دی تھی۔ اس کے بعد درخواست کا سراغ نہ ملا۔

اس موقع پر میں نے پھر سوال کر ڈالا "یار اُن دنوں دستاویزی فلمیں بنانے کے لیے بھی تو حکومت نے آپ کو روپیہ دیا تھا"

"ہاں ہاں دیا تھا۔ مگر وہ تو مزدوری تھی۔"

قتیل صاحب نے غیر ملکی دورے بھی کیے ہیں۔ جن دِنوں یہ رائٹرز گلڈ پنجاب کے سیکرٹری تھے۔ یہ روس گئے تھے۔ ادیبوں کا ایک وفد روس گیا تھا جس میں ان کے دو ساتھی مشرقی پاکستان کے تھے۔ مثلاً پروفیسر شوکت عثمان اور سرور مُرشد!

مگر یہ روس سے خوش نہ لوٹے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں ایک سیاح کے طور پر اپنایا گیا۔ ادیب کی حیثیت سے برتاؤ نہ کیا گیا۔

روس کے دَورے کے بعد قتیل صاحب نے لندن کا رُخ کیا۔ اپنے بیٹے کے پاس گلاسگو گئے۔ وہاں بیٹے کی انگریز بیوی سے جو گفتگو کرتے رہے وہ کچھ کچھ خاتون کے لیے اجنبی تھی اور کچھ کچھ ان کے لیے!

غرض یہ لوٹے تو بہت خوش تھے۔ کیونکہ انگریزوں کی دریا دلی نے ساری کلفتیں دُور کر دی تھیں۔ آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔ دل کی دُنیا مہک اُٹھی تھی۔ ایک شاعر

کو اور کیا چاہیے تھا ؟

یہاں ایک فقرہ لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ وہ یہ کہ کردار کی بے عمل خوبیوں سے باعمل شرارتیں زیادہ قیمت رکھتی ہیں۔

میں نے شروع میں ایک محاورہ تحریر کیا تھا کہ پٹھان کا پوت گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت، بے شک یہ بھوت بن کر بہت سامنے آئے مگر اب یہ انسانی عظمتوں کی تکریم کرکے اولیا بننے کے چکر میں ہیں۔

غرض ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اب نہ تو قتیل صاحب کی طبیعت میں ویسی تنک مزاجی رہی اور نہ ہی ویسی سینہ زوری، کیونکہ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شوخیاں اور طراریاں بھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تدبر کی جھلملاہٹوں سے زندگی منور ہو رہی ہے۔

میرا یہ مضمون، تاثر کچھ ایسا دے رہا ہے کہ جیسے میں قتیل صاحب سے اب بھی رُوٹھا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی قلبی کیفیتوں کا ذکر کرنا تھا۔ سو وہ کر دیا۔ میں نے جتنا قتیل صاحب کو جانا تھا۔ وہ بھی آپ کو بتلا دیا۔

باقی رہا قتیل صاحب کے بارے میں غیر تعصباتی تبصرہ، وہ صرف اتنا ہے کہ وہ ایک چاند ہے جو روشنی دیتا ہے۔

"کیا آپ نے کوئی ایسا چاند دیکھا ہے جو روشنی نہیں دیتا ؟"

"میں نے بہت دیکھے !"

مُوجد صاحب

آیئے آج رنگوں کی بات کریں ۔ نیلے، پیلے اور سُرخ رنگ کی ۔ بے شک بنیادی رنگ تین ہی ہیں ۔ مگر ان بنیادی رنگوں سے، جو سینکڑوں رنگ بنتے ہیں ۔ وہ بھی تو رنگ ہی ہوتے ہیں ۔

اسی طرح موجد صاحب کی شخصیّت کے بھی بنیادی رنگ چند ایک یا دو تین ہی ہوں گے لیکن اُن بنیادی رنگوں کے اتصّال سے جو متعدد رنگ، اپنی چھب دکھاتے ہوں گے ۔ اُن سب کا احاطہ میرے بس کی بات تو نہ ہو گی ۔ شاید اتنا ہو سکے کہ انھیں پہچاننے میں کسی حد تک آسانی ہو جائے ۔

انسان بڑا ہی عاجز اور بے بس ہے ۔ وہ ایک چیونٹی اور ایک پتّے کی ماہیّت کا بھی اندازہ نہیں لگا سکتا ۔ چہ جائیکہ وہ ایک انسان کو سمجھنے کا دعویٰ کرے ۔ بہر حال میرا دل چاہتا ہے کہ ایسی نارسائیوں کے باوجود، میں چند باتیں بشیر کے بارے میں کروں اور چند باتیں موجد کے بارے میں !

ابھی ان کی مَسیں بھیگی نہ تھیں کہ ریلوے کے محکمے میں، بہ حیثیت مزدور ملازم ہو گئے ۔ ریلوے ورکشاپ ایسی جگہ واقع ہے کہ آس پاس کئی ایک تاریخی عمارتیں

ہیں۔ گنبد نما مقبرے ہیں۔ اُن عمارتوں اور مقبروں میں بیل بُوٹے کڑھے ہوئے ہیں۔ کندہ ہیں۔ یہ انھیں دیکھ دیکھ کر، غیر ارادی طور پر بیل بُوٹے بنانے لگے۔ ان کی مشق جاری تھی کہ ایک دن اُدھر سے پینٹ شاپ کا انچارج گزرا۔ اُس نے پہلے تو ان کے کام کا جائزہ لیا۔ پھر کہا: "مزدوری چھوڑو، پینٹ شاپ میں چلو تاکہ شوق، تمھارا ساتھ بھی دے سکے۔"

چونکہ یہ سب کچھ اچانک اور آناً فاناً ہوا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے بوکھلاہٹ کے ساتھ ہی جواب دیا: "میں یہاں ٹھیک ہوں۔"

"ساری عمر مزدوری کرو گے؟"

"جی!"

اس جواب پر، اُس نے دوبارہ ان کے کاغذ پر بنے ہوئے بیل بوٹوں کا جائزہ لیا اور دوٹوک انداز میں کہا: "اٹھو میرے ساتھ چلو۔"

چنانچہ یہ اُٹھے اور اپنے مقدّر کو ساتھ لے کر اُٹھے۔

زندگی کو مطیع کرنے کے سلسلے میں، مقدر کو اپنا ہم عناں بنانے کے لیے، انھیں زندگی کی کٹھالی میں پڑنا پڑا۔ چنانچہ یہ جس جس رُخ سے تڑپے اور جتنے وہ کہانی آسانی سے سُنی جانے والی نہیں۔

کسبِ ہنر اس انداز سے سیکھا کہ گاؤں سے ہر روز، کوئی آٹھ کوس کا فاصلہ پیدل طے کر کے کام پہ پہنچا کرتے تھے۔ گھر واپسی بھی پیدل ہی ہوتی تھی۔ یوں اگر کوئی ایک دو روز ایسی مشقّت برداشت کر لے تو بات سمجھ میں آسکتی ہے مگر اُنھوں نے ایسا مسلسل چار برس تک کیا۔ گرمی ہو تو پہنچے، سردی ہو تو پہنچے، جھکڑ چلے تو پہنچے۔ ایسا انھوں نے خوشی سے نہیں کیا تھا۔ محض ناداری کی وجہ سے کیا یا لگن اور چینک کی پری کو رام کرنے کے لیے!

انھوں نے بتایا کہ جب میں پینٹ شاپ میں چلا گیا۔ حسبِ استطاعت کام کاج

کرنے لگا تو ایک دن انچارج نے مجھے کوئی ساٹھ فٹ اُونچی جگہ پر پہنچنے کے لیے کہا جس طرح نئی عمارتیں بنانے کے لیے "گو" (پاڑ) باندھی جاتی ہے ۔ اُسی صورت میں گو موجود تھی ۔ چنانچہ اس کی مدد سے اُوپر چڑھا ۔ ایک کنارے سے اُوپر چڑھا جیسا کہ قاعدہ ہے ۔ کام یہ تھا کہ اتنی اُونچی جگہ پر ایک ٹینکی کو پینٹ کرنا تھا ۔

انھوں نے ٹینکی کے اُوپر والا حصّہ پینٹ کر لیا ۔ اب نیچے اُتر کر نچلے حصّے کو پینٹ کرنا تھا ۔ انھوں نے بجائے کنارے سے اُترنے کے اور رسّوں کی مدد سے اُترنے کے درمیان ہی سے اُترنا چاہا ۔ وہ جگہ اندازے سے زیادہ نیچی نکلی ۔ تختے پر پاؤں پہنچنے کی بجائے لٹک گئے ۔ جیسے کیلے کے درخت پر لنگر (چرخا) لٹکا ہو ۔

اوسان خطا ہو گئے ۔ رونے اور چیخنے لگے ۔ لوگوں نے شور سُنا اور ایک شخص کو لٹکے دیکھا تو بھاگے اُوپر کی طرف ۔ اب یہ اتنی اُونچائی پہ لٹک رہے ہیں کہ کسی کا جلد پہنچنا بھی محال تھا ۔ آخر کتنی دیر لٹکتے رہتے ؟ قریب تھا کہ بے حال ہو کر نیچے گر پڑتے اور ختم ہو جاتے ۔ مگر اسی عالمِ سراسیمگی میں انھوں نے محسوس کر لیا کہ لوگ بچانے کے لیے پہنچ رہے ہیں ۔ حوصلہ دلا رہے ہیں ۔ چنانچہ انھوں نے بھی ، بہ ہزار جتن اپنے آپ کو سنبھالے رکھا ۔ بازو مسلسل بوجھ برداشت کرنے کی وجہ سے شل ہو چکے تھے ۔ اس کے باوجود ہونک ہونک کر بھی ، حد درجہ کی گھبراہٹ میں بھی ، اپنے آپ کو بچا ہی لیا ۔ مثلاً لوگ پہنچ گئے اور اُنھوں نے انھیں اُوپر کھینچ لیا ۔ جب یہ بچ گئے تو بیہوش ہو گئے ۔

میں نے کہا "یار بچ جانے کے بعد ، بے ہوش ہونے کے کیا معنی ؟"

کہنے لگے ۔ "لٹک کے دیکھ لو ۔ معنی معلوم ہو جائیں گے ۔"

ریلوے کی ملازمت چھوڑی ، کچھ بننے کے لیے ملازمت چھوڑی تو یہ کراچی میں تھے وہ دَوران ان پہ بڑا بھاری گزرا ۔ کوئی روزگار نہ تھا ۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ نہ تھا ۔ بے یار و مددگار کراچی جیسے مہنگے اور بے آپے شہر میں تھے ۔ جہاں ہمہ وقت انسان پر افراتفری کا

بھوت سوار رہتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان سے بے نیاز رہنے پر مجبور سا ہے۔

میں نے موجد صاحب سے پوچھا" جب کراچی میں تھے تو بیل ونہار کی ڈگر کیا تھی؟"

" بھائی! اُس دَور کو نہ کریدیں!"

"کیوں؟"

" میں اپنے حواس پر قابو نہیں پا سکتا۔ آنسو نکل آتے ہیں "

" اتنا کڑیل جوان اور آنسو؟"

" ہاں ہاں آنسو!"

"بے شک رو لیجیے مگر کچھ بتائیے ضرور!"

قصہ یہ تھا کہ ایک ٹھیکیدار قسم کا آدمی، دو تین لڑکوں کو پہلے تو بمبئی لے جانا چاہتا تھا۔ یہ بات ۱۹۴۷ء کی ہے۔ جب وہ ہمیں اس غرض سے اسٹیشن لے گیا تو ہم نے دیکھا کہ ایک گاڑی امرتسر کی طرف سے آئی۔ جو کٹی ہوئی لاشوں سے پٹی ہوئی تھی۔ جو زندہ تھے، اُن کی آہ و بکا سُنی نہ جاتی تھی۔ ہم دہل گئے۔ ہم نے بمبئی جانے سے انکار کر دیا۔

وہ شخص جو ہمیں بمبئی لے جا رہا تھا، اُس نے سوچا کہ لڑکے بمبئی کی طرف جانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ حالات بھی اچھے نہ تھے۔ جان کا خطرہ بھی تھا چنانچہ اُس نے ایک دم فیصلہ بدلا" ٹھیک ہے ہم بمبئی نہیں جاتے "

" تو پھر ہم گھر جائیں؟"

" نہیں نہیں کراچی چلتے ہیں۔ جو ہمارا دارالحکومت ہے "

چنانچہ ہم کراچی اس انداز سے پہنچے کہ جگہ ریل کی چھت پر ملی تھی۔ مگر ریل میں سوار اور ریل کے اُوپر سوار، سبھی خوش تھے کہ جان کو تو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ شاید ہی

وجہ تھی کہ ریل میں سوار، جو کہ زیادہ تر ہندوستان سے آئے تھے نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے اپنے سفر کو کاٹ رہے تھے۔ بالآخر کراچی شہر آگیا۔

ہمارا ٹھیکیدار ہمیں ایک جگہ ٹھہرا کر چلا گیا کہ ابھی آتا ہوں مگر وہ نہ آیا۔

ایک دن گزر گیا۔ وہ نہ آیا۔

دو دن گزر گئے۔ وہ نہ آیا۔

ہم خالی ہاتھ تھے۔ پیٹ بھی خالی تھا۔ جب دو دن کا فاقہ گزر گیا تو دن کو تارے نظر آنے لگے۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ نقاہت نے اُٹھنا بیٹھنا محال کر دیا۔ مرے کو مارے شاہ مدار، پہلے تو موسم بھی زیادہ سرد نہ تھا۔ اچانک بارش ہوگئی، سردی شدید ہوگئی۔

میں چونکہ پینٹر تھا۔ اس لیے ہمیں جس جگہ ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ اڈا بھی ایک پینٹر ہی کا تھا۔ چنانچہ جب سردی بڑھی تو ہم نے کپڑے کی چادروں کی بجائے لوہے کی چادروں سے سردی کو اپنے سے دُور رکھنا چاہا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا محض اعتباری دھوکا تھا۔ اُلٹی سردی اور زیادہ لگنے لگی۔ کیوں کہ چادریں خود ٹھنڈی یخ ہو رہی تھیں۔

اس ماحول میں جب فاقے کو تین دن گزر گئے۔ قریب تھا کہ رُوح پرواز کر جاتی تو اُس دکان پر ایک صاحب اپنے نام کی تختی لکھوانے کے لیے آگئے۔

"اُنھوں نے پوچھا" صاحب دکان کہاں ہیں؟"

"بیمار ہیں۔"

"مجھے اپنے نام کی تختی لکھوانی تھی۔"

"یہ کام ہم بھی کر سکتے ہیں۔"

"کیا لوگے؟"

"پانچ روپے!"

"اچھا لکھ دینا، کل آکر لے جاؤں گا۔"

انھوں نے سوچا کہ کل تک تو بھوک کی وجہ سے زندہ رہنا ہی محال ہوگا۔ لہٰذا گاہک سے کہا۔ "آج ہی لے جائیے گا۔"

"آج نہیں آسکتا۔"

"پھر!"

"کیا پھر؟"

"پھر!"

"آپ لوگ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ افیون کھا رکھی ہے کیا؟"

"کچھ بھی نہیں کھا رکھا۔ افیون بھی نہیں!"

وہ صاحب خاصے بدمزہ ہو رہے تھے۔ اُنھیں ہمارے طور کچھ اچھے نہ لگے۔ وہ واپس جانے لگے تو ہم نے گڑگڑا کر کہا۔ "اگر آپ تختی لینے کے لیے آج نہیں آسکتے تو براہِ کرم دو روپے بہ طور ایڈوانس دے دیں۔"

وہ صاحب تذبذب میں پڑ گئے۔ اُنھوں نے سوچا ہوگا، لڑکے بالے ہیں باتیں بھی اکھڑی اکھڑی کر رہے ہیں لہٰذا انھیں دو روپے دینا بھی مناسب نہ ہوگا چنانچہ اُنھوں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "کل آؤں گا۔ تختی لکھی ہوئی ہوگی تو پوری رقم دے دوں گا۔"

"مگر کل تک ہم نہ ہوں گے۔"

"کیا مطلب؟"

انھوں نے اپنی پوری رام کہانی سنائی کہ ہم یوں لاہور سے کراچی لائے گئے۔ یوں ٹھیکیدار نے سلوک کیا۔ یہ یقین بھی دلایا کہ فن کار ہیں۔ آپ کا کام ٹھیک ٹھاک

ہوگا۔ چنانچہ گاہک نے کچھ نیکی کے جذبہ سے کچھ بے دلی سے دو روپے ایڈوانس دے ہی دیئے۔

ایڈوانس ملنے پر ہم تینوں، ایک تھرڈ کلاس ہوٹل پہنچے۔ روٹیاں منگوائیں، دال منگوائی۔ تین دن کے بعد جاکر کھانا ملا تھا۔ وہ روٹی اور دال ہمیں اتنی لذیذ لگی کہ من و سلویٰ بھی کیا اس قدر لذیذ ہوگا۔ شاید یہ کرامت فاقہ کشی کی تھی۔

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ موجد صاحب کا شاعری سے بھی کوئی علاقہ رہا ہوگا۔ مصوّری کی طرف آنا یا ادیبوں سے خلوص و محبّت کے روابط کا استوار ہونا، یہ سب کچھ ان کی شاعری ہی کا تو اعجاز ہے۔

شاعری کی، تو اصلاح کے لیے احسان دانش ایسے پختہ کار اُستاد ملے۔ مُوجد تخلّص بھی انہیں کا عطا کردہ، احسان صاحب نہ صرف فنِ شاعری میں اہمیّت رکھتے ہیں بلکہ انسانی قدروں کے بھی دلدادہ ہیں۔ اُنھوں نے انھیں شاعری میں تاک بنانے کی بجائے مشورہ یہ دیا کہ شاعری ضرور کرنا، مگر پہلے اپنے مالی حالات کو استوار کر لو۔

یہ اپنے مالی حالات کو استوار کرنے میں اتنے منہمک ہوئے کہ شاعری سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ شوق ایسا اپنایا کہ تن من کا ہوش نہ رہا۔ ورنہ یہ مسلم لیگ کے جلسوں میں شعر خوانی کیا کرتے تھے۔ قوم کو بیدار کرتے کرتے خود فن کی بھول بھلیّوں میں کھو گئے۔

بہرحال ان کا اہلِ قلم سے رشتہ ایسا استوار ہوا کہ وہ ان کے لیے زندگی کا سرمایہ بن گیا۔ جہاں یہ اپنی ابتدائی زندگی میں بورڈ نویسی کیا کرتے تھے۔ وہاں انھیں سرفراز ایسا پینٹر میسّر آیا۔ جو اپنے فن میں یکتا تھا۔ اُس عظیم پینٹر ہی کے جلو میں مولانا صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا کا دفتر تھا۔ جہاں ادیبوں کا جمگھٹا رہتا۔ وہیں یہ متعدد ادیبوں سے ملے۔ پھر وہ ملنا، زندگی بھر کا ملنا ٹھہرا۔

مکروہاتِ زمانہ کا سایہ ہر شخص پر پڑ رہا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی اُلجھنوں میں گرفتار

ہے۔ ہر شخص مصروف ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے مسائل میں اٹکا اور لٹکا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری طرف سے بھی، دوستوں کی خدمت میں حاضری برائے نام رہ گئی ہے دوست میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ یہ اُن کی دریا دلی ہے۔ میں اُس حد تک اُدھار نہیں اُتار سکتا جس حد تک کہ دوست ملاقاتوں کے قرض میں دبا دیتے ہیں۔ اس لیے میرا ضمیر جب مجھے دوستانہ حقوق ادا نہ کرنے پر ملامت کرتا ہے تو میں دوستوں سے ملنے کا خاص طور سے اہتمام کرتا ہوں۔

چنانچہ چھٹی کے ایک روز، میں موجد صاحب کے ہاں پہنچا۔ معلوم ہوا گھر پر نہیں ہیں۔ لہٰذا میرے نیک جذبہ کو پسینہ آگیا۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ ناچار واپس آگیا۔

دوسرے دن ٹیلی فون کیا۔ شکایت کی "میں گھر پہنچا۔ آپ غائب!"

کہنے لگے "آج کل کام کرنے کا موڈ ہے۔ اس لیے میں نے چھُٹی کا دن بھی دفتر میں گزارا اور ایسا کئی ماہ سے ہو رہا ہے۔"

"اچھا!"

"جی ہاں!"

"آخر کیا کر رہے ہیں؟"

کہنے لگے "یہی احساس تو مارے دے رہا ہے کہ کیا کچھ نہیں۔ کچھ کر لینا چاہیے۔ زندگی کے دن گنے چُنے ہیں اور وہ گزر رہے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ اپنے بُرے بھلے فن کے ذریعہ، لمحات کو قید کر دوں تاکہ وہ لمحہ جو موجود ہے گزرنے نہ پائے۔"

میں نے ان کے لڑکپن کی ایک تصویر دیکھی جو نیشنل گارڈ کی وردی میں ہے۔ میں نے دریافت کیا "یہ کیا حرکت؟"

کہنے لگے "ایسی حرکتیں میں نے کئی کی ہیں نیشنل گارڈ کی وردی میں نے اس لیے پہنی تھی کہ قوم کی خدمت کا ایک یہ بھی راستہ ہے۔"

"پھر"؟

"جب تک چل سکا چلا۔ پھر چند لیڈروں کی خود غرضیوں نے بد دل کیا۔ وردی اُتار دی"۔

"وردی نہیں اُتارنی چاہیے تھی"۔

"کیوں؟"

"اگر آدمی لیڈروں کی طرف دیکھتا رہے گا تو وہ وردی نہ پہن سکے گا۔ اس لیے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے مسائل کی وردی پہنے اور جس میدان میں جو کچھ کر سکتا ہے کرتا رہے"۔

ان کی طبیعت میں تھوڑی بہت اچپلی بھی ہے۔ ہر وقت منہ بسور کے نہیں بیٹھے رہتے۔ ایک دن ہم تفریحی موڈ میں تھے۔ باوجود اس کے کہ حالات نے انھیں پژمردہ کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود جُملہ ساز ہیں۔ ٹھکانے کا فقرہ کستے ہیں۔ ایک دوست کا رونا رو رہے تھے کہ "اُس کی دو بیویاں ہیں۔ دونوں نے زندگی دوبھر کر رکھی ہے۔ باغ و بہار قسم کا آدمی تھا۔ مگر بجھ کے رہ گیا ہے"۔

میں نے کہا "یا تو آدمی بیویاں کرلے۔ یا پھر ایک پہ گزارہ کرے"۔

کہنے لگے "یہ کیا بات ہوئی؟"

"کوئی بات ہی نہیں ہوئی؟"

"ہاں ہاں ہوگئی کہ آدمی بے نکاحی دس بیویاں کرلے مگر نکاحی بیوی ایک ہی کافی ہے"۔

ایک دن ہم دونوں دردمندانہ موڈ میں تھے۔ قوم کا غم کھا رہے تھے۔ میں نے استفسار کیا "آپ نے ایک بار، ایک ماہانہ پرچہ کا ڈیکلریشن لیا تھا۔ اس کے بعد پرچہ نہ نکالا۔ کیا ڈیکلریشن کینسل ہوگیا؟"

"نہیں ڈیکلریشن قائم ہے ۔ ضابطے کی خانہ پُری ہو رہی ہے ۔"

"پھر قباحت کیا ہے ؟"

کہنے لگے ۔" دن بہ دن انسان، انسان سے دُور ہو رہا ہے ۔ پرانی قدریں دم توڑ رہی ہیں ۔ وہ باتیں جو اخلاق کے دائرے میں آتی تھیں، دوستی کی حدود میں آتی تھیں ۔ آج اُن کا تمسخر اُڑایا جاتا ہے ۔"

"پھر انہی اقدار کے تحفظ کے لیے ہی پرچہ نکالیں ۔"

"اب ایسا نہ ہو سکے گا ۔"

"آخر کیوں ؟"

" مجھے دن بہ دن تنہائی کا احساس ہو رہا ہے ۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی ہم سے دوستی، اخلاق، رواداری اور محبّت کو لُوٹ کر لے گیا ہو ۔"

میں نے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لیے کہا ۔" آپ بد دل نہ ہوں ۔ تھانے میں جا کر رپٹ لکھواتے ہیں ۔ اخلاق، رواداری اور محبّت کو برآمد کرا لیں گے ۔"

کہنے لگے ۔" طفیل صاحب یہ دَور اور یہ معاشرہ اِتنا کریہہ ہو چکا ہے کہ اس میں کوئی یہ کیسے کر سکے گا کہ آگ میں پھُول اُگا کر دکھا سکے ۔"

"چلو آگ میں آگ اگائیں ۔ علاج بالمثل کریں ۔"

" ایسے کرب ناک دَور میں، شوخی کی باتیں بھی اچھی نہیں لگتیں ۔ میں مایوسی کی انتہا پر پہنچ چکا ہوں ۔"

" اچھا، میں شوخی سے کام نہیں لیتا ۔ منہ بسور کے بیٹھ جاتا ہوں ۔ لہٰذا پڑھیے فاتحہ !"

" فاتحہ ؟"

"ہاں ہاں فاتحہ!"

"نہیں ابھی وقت فاتحہ کا نہیں آیا۔ ابھی ہم اس قوم کے سنبھلنے کی دُعا کرتے ہیں۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں۔"

"آپ تو کہتے تھے کہ "سخنور" کیوں نہیں نکالتے۔"

"ہاں ہاں، میں نے تو یہی کہا تھا۔"

"پھر؟"

"آج پرانی قدروں کو زندہ کرنے کے لیے، اخلاق کو واپس لانے کے لیے، دوستی کی قدر و قیمت کو اُجاگر کرنے کے لیے، محبّت کو عام کرنے کے لیے، قلمی جہاد کی ضرورت ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ پرچہ کیوں نہیں نکالتے۔"

میں موحد صاحب کا مدّاح ہوں۔ پرستار ہوں۔ بس ایک ادا پر مرمٹا ہوں۔ وہ ادا ہے "وقت پر کام آنا"۔ اگر ان میں متعدد خرابیاں ہوتیں تو بھی میں، ان کے اس ایک وصف پر جُملہ برائیوں کو نظر انداز کر دیتا۔ اگر کسی میں متعدد خوبیاں ہوں اور ایک یہی وصف نہ ہو، جو موحد صاحب میں ہے تو میں اُسے دوستی نہ کہوں گا۔ تعلقات کی شعبدہ بازی کہوں گا۔

رائٹرز گلڈ کی جائیداد کی واگزاری کا مسئلہ تھا۔ ہائی کورٹ سے ہمارے حق میں فیصلہ ہو چکا تھا۔ سپریم کورٹ سے بھی فیصلہ ہو چکا تھا۔ فیصلے اپنی جگہ، قانون بیشک ہمارے حق میں تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ جائیداد جو ہماری تھی، جس پر غیر قابض تھے وہ ہمیں ملے کیسے؟ قبضہ ہو تو کیسے ہو؟ جب کہ اُس جائیداد پر دو وکیل موجود ہوں۔ ٹھیکیدار ایسوسی ایشن کے دفاتر ہوں۔ قابض خاندان کے علاوہ گیارہ خاندان بھنگیوں کے بھی آباد ہوں۔

جب میں نے جائیداد مذکورہ پر، قبضہ حاصل کرنے کے، جملہ مراحل پر غور کیا تو مجھے ادیبوں میں کوئی ایسا حوصلے والا نظر نہ آیا جو لیسے میں ثابت قدم رہ سکتا۔ مارپیٹ میں دم خم دکھا سکتا۔ بہت سوچ کر میں نے موجد صاحب کو ٹیلی فون کیا" قصّہ یہ ہے کمک کی ضرورت ہے۔"

انھوں نے فوراً کہا" میں حاضر ہوں۔ میرے دوست آپ کا ساتھ دیں گے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

تجربے نے بتلا رکھا تھا کہ موجد صاحب جو کچھ کہہ رہے ہیں، ویسا ہی عمل کی صورت میں بھی ظاہر ہوگا۔ یہ لفظی دوستی سے زیادہ عملی دوستی کے قائل ہیں۔ یہ خوبصورت الفاظ کو، دوستی کے باب میں زہر قاتل سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ دورانِ مقدمہ بھی موجد صاحب، میرے ساتھ سارا سارا دن عدالتوں میں کھڑا رہتے تھے۔ تھانوں تک میں میرے ساتھ تھے۔ غرض ہر تکلیف دہ مرحلے میں ساتھ تھے۔ یعنی اُس وقت بھی میرے ساتھ تھے کہ جب علاقے کے تھانیدار نے کہا" ہم آپ دونوں کو گرفتار کریں گے۔" ہم تھانیدار صاحب کا منہ دیکھنے کے علاوہ کیا کر سکتے تھے کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے باوجود ایسا کہہ رہے تھے۔ چنانچہ اس مرحلے پر میں تو تھوڑا سا گھبرایا بھی مگر موجد صاحب نے جواب میں کہا" گرفتاری دینے کے لیے ہم حاضر ہیں مگر کل آپ اس کرسی پر موجود نہ ہوں گے۔"

وہ ادیب، شاعر اور مصوّر ہی نہیں، جس کا دل گداز نہ ہو۔ جو دوسرے کے مرنے سے پہلے خود نہ مر جاتا ہو۔ اس کلیہ پر میں نے موجد صاحب کو پورا اُترتے دیکھا۔ وہ محبّت کا بھی بھوکا ہے۔ جب محبّت کا جواب اُسے محبّت سے نہیں ملتا، تو بیکل ہو جاتا ہے۔ اپنے حواس کھو دیتا ہے۔ میں تھوڑی سی تمہید کے ساتھ ایک واقعہ سناتا ہوں جس نے وقتی طور پر مجھے تو لوہے سے موم کر دیا تھا۔

ایک دن یہ فلسفیانہ موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انداز یہ تھا کہ ایک کرسی پہ خود بیٹھے تھے اور دوسری کرسی پہ ان کے پاؤں رکھے تھے۔ سگریٹ کا کش بھی اس انداز سے لے رہے تھے کہ جیسے جتلا رہے ہوں کہ دیکھنے والے دیکھ لیں کہ میں اس وقت اپنے من کا بادشاہ ہوں۔

میں نے رعایا کا ایک فرد بن کر پوچھا "عالیجاہ! اجازت مرحمت فرمائیں تو بندہ آپ کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھنے کی جسارت کر لے۔"

"جسارت کی اجازت دی جاتی ہے۔"

جب اجازت مل گئی تو میں نے موجد صاحب سے کہا "اب آدمی بن جائیے تاکہ چند منٹ جو میرے پاس ہیں وہ آپ کے جاہ و جلال کی نذر نہ ہوں۔"

کہنے لگے "لیجئے مابدولت آدمی بن گئے۔"

میں نے پوچھا "اس وقت آپ بڑے اچھے موڈ میں ہیں؟"

کہنے لگے "آپ کے آنے سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے میں رو رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُن دوستوں کے لیے، جن کی خدمت میرا ایمان تھا۔ وہ بھی مجھے سینے سے لگانے کے لیے تیار نہیں۔"

"کوئی قصور آپ کا ہوگا۔"

میرے اس فقرے پر موجد صاحب بے قابو ہو گئے۔ میں نے انھیں سینے سے لگایا تو بھی چُپ نہ ہوئے۔

میں نے پریشان ہو کر، اس گرانڈیل شخص سے کہا "چپ کرو۔ خدا کے لیے چُپ کرو۔"

"نہیں نہیں!"

"آخر ہوا کیا؟"

"کیا بتاؤں، آج میں نے خود روشنی کے سورج کو ڈوبتے دیکھا ہے۔"

میں موجد صاحب سے بڑا ہوں۔ مشورہ دینا میرا حق تھا۔ مگر اُنھوں نے مجھے مشورے سے نوازا، قبل اس کے کہ میں آپ کو ان کے مشورے سے آگاہ کروں، پہلے میری بپتا سن لیں۔ اس کے بعد موجد صاحب کے مشورے کا مزہ آئے گا۔

میں موجد صاحب سے یہ کہہ رہا تھا۔" میں بکھر کے رہ گیا ہوں۔ میں نے متعدد موضوعات پر کام شروع کر رکھا ہے مگر ان کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ حالانکہ روزانہ پندرہ سولہ گھنٹے کام کرتا ہوں۔ فلاں موضوع ادھورا ہے۔ فلاں بھی اور فلاں بھی!

کہنے لگے۔" میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ٹیم ورک پر غور کریں۔ اپنے ساتھ دیگر سوجھ بوجھ والے لوگوں کو بھی شامل کریں تاکہ اُدھورے کام مکمل ہو جائیں۔"

میرا جواب یہ تھا۔" ایسا نہ ہو سکے گا۔"

"کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ اوّل تو یوں میری مرضی کا کام نہ ہو سکے گا۔ دوسرے یوں کہ میں نے جس آدمی کے سپرد، ذرا سا بھی کام کیا وہ ڈھنڈورا پیٹتا پھرے گا کہ نقوش کا تو سارا کام میں کر رہا ہوں۔"

"اچھا؟"

"جی ہاں!"

"پھر آپ کے نامکمل کاموں کا کیا ہوگا؟"

"قصّہ یہ ہے دوست کہ جتنی زندگی ہے اس کا ایک ایک لمحہ، ادب کی نذر کروں گا۔ باقی اللہ مالک!"

موجد صاحب نے اپنی بات کی تائید میں بتلایا کہ ہندوستان میں نامور مصوّر سوبھا سنگھ اور کرشن نے اپنے ہاں کئی کئی مصوّر بٹھا رکھے ہیں جو اُن کے لیے کام

کرتے ہیں۔ نوآموز اس لیے خوش ہیں کہ وہ بڑے مصوّروں سے کچھ سیکھ رہے ہیں۔ مذکرہ مصوّر اس لیے نہال ہیں کہ اُن کے کاموں میں ہاتھ بٹانے والے موجود ہیں۔

میں نے کہا "مصوّر خوش قسمت ہیں کہ اُن کے ہاں کوئی اپنے آپ کو نوآموز سمجھتا ہے۔ ادیبوں کا معاملہ یہ ہے کہ یہ تو اپنی تحریر کے پہلے دن سے ہی، اُستاد ہوتے ہیں۔"

بات طویل ہوتی جارہی ہے۔ اسے سمیٹنا چاہیے۔ کیا میں نے غلط کہا ؟ قصّہ مختصر، موجد صاحب کے دو رنگ ہیں، دو روپ ہیں۔ ایک میں وہ خود براجمان ہیں، دوسرے میں ان کا فن، پہلے میں ذرا شتابی سے ان کے فن سے نپٹ لوں۔ اس کے بعد ان کی شخصیت سے لپٹ جاؤں گا۔ جیسے کسر رہ گئی ہو !

پہلے یہ کہہ دوں کہ مصوّر ہونا اور بات ہے اور مصوّری کرنا اور بات، اس فرق کو ذہن میں بٹھا کر آگے چلیں گے تو بات کا سمجھنا سمجھانا آسان ہو جائے گا۔

مصوّری کا قصّہ یہ ہے کہ عبدالرحمٰن چغتائی جب زندہ تھے تو وہ بھی ان کے فن کے معترف تھے۔ انھیں بھی ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے کاموں کی تکمیل کے سلسلے میں، ان سے مدد لیا کرتے تھے۔ مثلاً ڈرائینگ کر دی۔ روشنائی سے اُجالنے کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ یہ بیل بوٹوں کی حد تک، بال باریک کام خوب کرتے ہیں۔ چغتائی خوش اس پر تھے کہ دردسری سے جان چھوٹی، یہ نازاں اس پر کہ کچھ سیکھ لیا۔

یوں تو موجد صاحب ہر نوع کی تصویریں بناتے ہیں مگر جسے پین ورک کہتے ہیں، اس میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ باریک سے باریک لائن بھی اتنے فن کارانہ انداز سے لگائیں گے کہ مصوّرِ قدرت کی کھینچی ہوئی معلوم ہو گی۔ یعنی چیونٹی کو چیونٹی اتنا بنا کے دکھادیں گے۔ چیونٹی کی ٹانگیں بھی نظر آئیں گی۔ اُس کا منہ بھی نظر آئے گا

عاجز ہوں گے تو صرف ایک مرحلے پر کہ چیونٹی کا دھڑکتا ہوا دل نہ دکھا سکیں گے۔

لیونارڈو کی طرح، انھیں مونالیزائیں بنانے کا شوق ہے۔ وین گاگ کی طرح لینڈ اسکیپ کا، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میدان میں ان کا درجہ کیا ہے۔ بہرحال انھیں آپ جو درجہ بھی دیں گے۔ اس میں بھی یہ اچھی خاصی اُونچی کرسی پر نظر آئیں گے اساتذۂ فن کے دربار میں بیٹھے ہوں گے۔

فنِ مصوّری میں ایک شعبہ کمرشل آرٹ کا بھی ہے۔ اس میدان میں ان کے بنائے ہوئے سرورق ایک دھوم مچائے ہوئے ہیں۔ پاک و ہند کی بیشتر معیاری کتابوں کے سرورق، ان کے فن کی گواہی دیتے ہیں۔ ہرچند کہ یہ میدان ان کے لیے صرف روزی کا وسیلہ ہے۔ فن کے اظہار کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تڑپتے رہتے ہیں کہ موقع ملے تو قلم و برش کی عظمتوں کا بھی اظہار کر دوں۔ یہ چپکے چپکے کچھ کرتے بھی رہتے ہیں۔ کسی دن اچانک علم ہوگا کہ یہ تو چھُپے رستم نکلے۔ ہرچند کہ فن کی دھاک تو اب بھی ہے مگر وہ دھاک تو مستقبل کی ڈوری سے بندھی ہوگی۔

اس عملاً آزاد اور ذہناً غلام ملک کا وطیرہ یہ ہے کہ چاہے جتنا کچھ کر لو۔ آسمان سے تارے توڑ لاؤ۔ کوئی نہ پوچھے گا۔ اپنوں کی تعریف کرتے ہوئے ہم بہت ڈرتے ہیں۔ جیسے یہ عمل ذہنوں کو نقب لگانے کا ہو۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ تھا کہ ہم اپنے فن کاروں اور دانشوروں کو مشورہ دیا کرتے تھے "پہلے مرجاؤ۔ پھر ہمارے کرتب دیکھنا"۔ اب وہ ڈھارس بھی ختم ہوگئی۔ یاروں نے مرکر بھی دیکھ لیا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ مکمل مصوّر ہیں۔ ورنہ بیشتر بڑے مصوّر بھی ادھورے مصوّر ہوتے ہیں۔ یک رُخے ہوتے ہیں۔ یعنی ان کا مقام ایک فیلڈ میں ہوتا ہے۔ ہر جہت میں کامل نہیں ہوتے۔ البتہ ایک کوتاہی ان کے فن میں ضرور ہے کہ پکاسو کی طرح، تجریدی آرٹ کے دلدادہ نہیں۔ یہ زندگی کے عکاس ہیں۔ یہ حقیقتوں کے

پرستار ہیں ۔

میں شخصیت نگار ہوں۔ فن کا ناقد نہیں۔ مضمون بھی طویل ہو رہا ہے۔ اس لیے مدّعا کو مختصر کرنا چاہیے۔ لہذا شخصی اعتبار سے حاصلِ کلام کی طرف مُڑنا چاہیے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مُوجد بہت بُرا آدمی ہے، اکھڑ ہے، پارٹی باز ہے، مُنہ زور ہے، ہنجھ چھُٹ ہے۔ یہ ساری باتیں تسلیم، مگر جن دوستوں کی یہ رائے ہے انھیں ذرا سا مغالطہ ہُوا ہے۔ یہ بات تو صحیح ہے کہ موجد یا تو آپ کا دوست ہے یا آپ کا مخالف، اِسے منافقت نہ تو راس آتی ہے اور نہ ہی اس کا اسیر ہے۔ وہ حساب کا سیدھا سادا سوال جانتا ہے۔ اس کے نزدیک دو اور دو نہ تو تین ہو سکتے ہیں اور نہ پانچ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاندیدہ لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا ہے۔

مجھے ایسا شخص کوئی نہیں ملا جس نے دوستی کی دہلیز پہ آکر انھیں آواز دی ہو، اور اِدھر سے لبیک کی آواز نہ آئی ہو۔ میں خود ان سے کافی عرصہ بدگمان رہا۔ بالآخر ان کی دوستانہ تپیا نے بدگمانیوں کی مَیل کو دھو ڈالا۔ میں دنیا کے بڑے سے بڑے جھُوٹ پر اعتبار کر سکتا ہوں مگر یہ نہیں مانوں گا کہ مُوجد دوستی کی روش پرست روی کا شکار ہو سکتا ہے۔ وہ اس راہ میں آپ سے چند قدم آگے ہی ہو گا۔ وہ ہوٹل میں چلتے پینے سے لے کر مرنے مرانے تک آپ کا ساتھ دے گا۔

یہ نمازیں نہیں پڑھتے۔ روزے نہیں رکھتے۔ مگر دل ان کا مسلمان ہے۔ عمل ان کا مومنانہ ہے۔ جب بھی اور جہاں کہیں بھی، مسلمان پہ آڑا وقت آیا۔ یہ بیکل ہو گئے۔ معرکہ عربوں اور اسرائیل کا ہو تو یہ بے چین، شرپسند کعبہ میں گھُس جائیں تو یہ بے حال، افغانستان میں مسلمان شہید ہو رہے ہوں تو یہ آزردہ، غرض انسانیت جہاں بھی بے آبرو اور پامال ہو رہی ہو یہ تڑپتے رہیں گے ۔

یہ دوستوں کے لیے خوشیاں خریدتے رہتے ہیں۔ اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ

فلاں فلاں دوست آپس میں روٹھ بیٹھے ہیں تو یہ تلملانے لگ جائیں گے۔ اسکیمیں بناتے رہیں گے۔ بالآخر انھیں گھیر گھار کر چائے کی میز پر بٹھا دیں گے تیکوک رفع کرائیں گے۔ کدورتیں دُور کرائیں گے۔ تب ان کے ہونٹوں پر جو ہلکی سی مسکراہٹ آئے گی۔ وہی ان کا انعام ہو گی۔ یہ وصف ان میں ایسا ہے کہ دوست بے دھڑک ہو کر روٹھتے رہتے ہیں۔

موجد صاحب کے دوستی کے باب میں کچھ اصول ہیں۔ وہ یہ کہ ہر حال میں ساتھ دینا، وہ یار کی یاری کو دھیان میں رکھتے ہیں۔ عیوب کو ذہن میں نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی دل پکڑ کے بیٹھ جاتے ہیں کہ ملنے والے کوتاہیوں کو دھیان میں رکھتے ہیں۔ یاری کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔ وہ دوستانہ حد بندیوں میں نماز سے پہلے وضو کے قائل نہیں۔

میں یہ مان سکتا ہوں کہ دوستی کے زعم میں، یہ بڑی بڑی گنجائشوں کے متمنی ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوستی کے حق حقوق کے بدلے، جب ان کے حصے میں بے رخی آتی ہے تو بیزار ہو جاتے ہیں۔ معاملہ بدگمانیوں سے لے کر، نیتوں کی ٹیڑھ تک جا پہنچتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دوستی میں ہیر پھیر کے قائل نہیں بے خطر آگ میں کودنے کے مدعی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے دوست، ان کی دوستی کے جلال کی تاب نہ لا کر بہانے ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں۔

یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ آرٹسٹ کو بڑا ملائم ہونا چاہیے۔ مدھم آواز میں بات کرتا ہو چلے تو اتنا سہج سہج کہ ایک قدم سے دوسرے قدم تک دس تک گنتی ہو سکے۔ اگر مصوّر ہونے کی خصوصیات یہی کچھ ہیں تو یہ قطعاً مصوّر نہیں۔ بلکہ برعکس ہیں۔ عقاب ٹائپ کی شے!

آرٹسٹ ہونے کا جو حال میں نے اُوپر بیان کیا ہے۔ اس اعتبار سے

تو چغتائی بھی آرٹسٹ نہ تھے۔ وہ قد کاٹھ کے آدمی تھے۔ جو اِن رعنا ٹائپ کے جسم بھی بھرواں، چہرے پر بھی جلال، جو چغتائیوں کا خاصہ ہے۔

بہرحال قد کاٹھ اور نستعلیقیت ہیں کیا رکھا ہے۔ موجد کے تن میں جو من ہے وہ بھلے آدمی کا ہے۔ جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یہ دولت جو موجد کے پاس ہے وہ بڑے بڑے امیروں کے پاس بھی نہیں۔ امیر تو عموماً بہت غریب ہوتے ہیں۔

یہ دنیا اتنی نا اعتباری ہوگئی ہے کہ انسان کو کمپیوٹر کے ذریعہ بھی پہچاننا مشکل ہوگیا ہے۔ صورت حرام لوگ تو تھے ہی، اب تکلّم حرام بھی ہو گئے۔ پہلے لوگ کہا کرتے تھے کہ زبان سے نکلے ہوئے دو جملے بھی، انسان کو پہچاننے میں مدد دے سکتے ہیں۔ اب تو لوگ گفتگو کریں گے تو ایسی پیاری کہ دل جھُوم اُٹھے۔ عمل سامنے آئے گا تو شیطان بھی شرمندہ ہوگا۔ اب تو یہ ہے کہ دل کا حال اللہ ہی جانے تو جانے، یہ دُنیا تو آرٹسٹ ہوگئی۔

میں نے جو آپ سے گفتگو کی۔ وہ دو ٹوک انداز کی ہے۔ اس میں نہ تو میرا کوئی کمال ہے اور نہ ہی میری کوئی خوُبی، کیونکہ میری تحریر کا یہ تیور، موجد صاحب کی رنگِ طبیعت کا خاصہ ہے۔ اگر اِن سطور میں موجد صاحب کا پرتو نہ ہوتا تو میری تحریر مصلحت اندیش ہوتی مگر اس میں موجد صاحب نہ ہوتے۔

میں نے جان بوجھ کر، ان کے فن پر باتیں تھوڑی کی ہیں اور ذات کے بارے میں زیادہ، وہ اس لیے کہ جو کام میں نے آج اُدھورا چھوڑا ہے اُسے مکمل کرنے والے لوگ پیدا ہوں۔ مگر جس کام کو میں نے مکمّل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مکمّل کرنے والے لوگ نسبتاً کم ہوں گے۔

فن کا تو یہ ہے کہ وہ کبھی نہیں مرتا۔ جسم کا یہ ہے کہ وہ دفن ہو جاتا ہے

جو چیز دفن ہونے والی ہے پہلے مرحلے پر اس کی تصویر کھینچ لینی چاہیے۔ دوسرا مرحلہ آتا رہے گا۔ کیونکہ بڑے فن کار کا تو یہ ہے کہ اس کے لیے تو دوسرا مرحلہ ہی سب کچھ ہوتا ہے جس کے لیے کسی دوست کی تحریر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بے شک میں نے سطورِ بالا میں، فن پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی شخصیت کے نکھار میں بھی قلم کو روکا، ورنہ دل تو اور بہت کچھ لکھنے پر اکسا رہا تھا۔ نتیجہ، گلشن میں پھولوں کو گننے کا شغل ہو جاتا۔

قاسمی صاحب

عطاء الحق قاسمی، فطین بھی ہے اور شریر بھی۔ اس لیے آدمی بھی ہے اور انسان بھی۔ یہ امر اس کی فطانت کی دلیل ہو یا نہ ہو، اس کی شرارت کی دلیل ضرور ہے کہ اُس نے آج اتنا بڑا مجمع اکٹھا کر لیا۔ اتنی خلقت یا تو میں نے میڈم نور جہاں کے فنکشن پر دیکھی تھی یا اس تقریب پر!

کسی کے بارے میں کلمۂ خیر کہنا اچھی بات ہے۔ مگر دیکھنا یہ بھی ہوتا ہے کہ کلمۂ خیر کس کے بارے میں کہنا ہوگا۔ اگر کسی کے بارے میں کلمۂ خیر کہنے کی گنجائش نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے۔

یہاں پہ مجھے ایک دو ایسے فقرے اور لکھنے چاہییں جس سے اس امر کی وضاحت ہو کہ میں کہنا کیا چاہتا ہوں۔ مگر میں وہ ایک دو فقرے نہیں لکھ رہا۔ اس لیے کہ میں بھی نہیں چاہتا کہ میری بات کی وضاحت ہو۔ کون دشمنی مول لے۔ کون دوستی مول لے، دشمنی مول لینے کا محاورہ تو سب نے سُنا ہوگا۔ دوستی مول لینے کی بات نہیں سُنی ہوگی۔ میرے نزدیک دشمنی مول لینے سے زیادہ خطرناک دوستی مول لینا ہے۔ کیونکہ دشمن اپنے لیے خطرناک ہوتا ہے اور دوست دوسروں کے لیے!

عطاالحق قاسمی نے اپنی کتاب "روزنِ دیوار سے" بڑے ٹھٹھے کے ساتھ پیش کی ہے۔ اس ٹھٹھے میں گھمنڈ بھی ہے اور اعتماد بھی، سلیقہ بھی ہے اور طرحداری بھی۔ اس کے باوصف میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔

"مولانا قطب الدین شیرازی مشہور ظریف بزرگ ہو گزرے ہیں۔ جن کے متعلق کئی لطیفے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی یہودی تاجر نے جو ان کا ہمسایہ تھا۔ ان سے کہا مولانا ہمارا مذہب کیوں قبول نہیں کرتے؟ مولانا نے جواب دیا۔ ان دنوں میرا ہاتھ تنگ ہے۔ چالیس دن کا سامان خور و نوش میرے ہاں بھجوا دو۔ یہ مدت ختم ہونے پر تمہارا دین قبول کر لوں گا۔ یہودی نے یہ بات مان لی اور چالیس دن کا آذوقہ ان کے ہاں بھجوا دیا۔

چالیس دن ختم ہوئے تو یہودی تاجر بہت سے یہودیوں کو ساتھ لے کر مولانا قطب الدین شیرازی کے ہاں پہنچا اور کہنے لگا۔ اب وعدہ پورا کیجیے۔ مولانا نے جواب دیا۔ میں چالیس سال سے مسلمانوں کا دیا کھا رہا ہوں اور آج تک مسلمان نہیں ہوا۔ اگر تم نے سمجھ لیا کہ میں چالیس دن تمہارا دیا کھا کے یہودی ہو جاؤں گا تو سخت غلطی کی۔"

(حرف و حکایت)

یہی بات میں عطاالحق قاسمی سے کہتا ہوں کہ ہم نے کم و بیش چالیس برس کے اخباری کالم پڑھ رکھے ہیں اور آج تک مسلمان نہیں ہوئے۔ ایکا ایکی عطاالحق قاسمی کے کالم پڑھ کے کیسے مسلمان ہو جائیں گے؟ یہ ایک سوال ہے۔ ممکن ہے اس کا جواب مل جائے۔

یقین کر لیجیے۔ میں عطا کو نہیں جانتا۔ نہ جلوت میں دیکھا۔ نہ خلوت میں، نہ جمال

میں دیکھا نہ جلال میں، نہ اچھے حال میں دیکھا نہ بُرے حال میں، جو کسی کو ایک حال میں دیکھتا ہے وہ سبھی طرز کے مضامین لکھ سکتا ہے۔ خاکہ نہیں لکھ سکتا اور کسی کا یہ عجز ہو یا نہ ہو، میرا تو صدقِ صد!

میرے ان سے روابط کچھ تکلف کے سے انداز کے رہے "سر! میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے حاضر ہوا ہوں۔ میرے پلاٹ کا مسئلہ ہے"۔

یہ عطا کی شرافت ہے کہ وہ مجھے تعظیم کے ساتھ بلاتے ہیں۔ ورنہ جو اتنا منہ زور صحافی ہو۔ وہ سر وَر نہیں کہا کرتا۔ اُن کا لہجہ تحکمانہ ہوتا ہے جیسے اپنے بھائی انتظار حسین کا، اگر انتظار مجھ سے بات کرتے تو کہتے، طفیل صاحب یہ بتائیے کہ میرے پلاٹ میں گھپلا کیا ہے؟

یا ایک اور موقع پر، عطا نے مجھ سے کہا "سر! میں اپنے کالموں پہ مشتمل کتاب چھپوانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے کوئی مشورہ دیجیے تاکہ آبرو بنی رہے"۔

کوئی اور کالم نویس ہوتا تو یہ کہتا "طفیل صاحب! اپنے اُن کالموں پہ مشتمل اپنی کتاب چھپوا رہا ہوں کہ جن کی دھوم ہے۔ کتاب چھپنے کی دیر ہے۔ بڑے بڑے کالم نویس گرد ہو جائیں گے۔ یہ لہجہ بھائی ابراہیم جلیس کا ہوتا۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عطا حد درجہ مؤدب ہے۔ حد درجہ انکسار پسند ہے حد درجہ جذباتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ان میں سے میری کسی بات کو تسلیم نہ کریں گے۔ نہ آپ انھیں مؤدب ماننے کے لیے تیار ہوں گے نہ انکسار پسند اور نہ ایک پیارا سا جذباتی انسان!

کہیں گے حد درجہ کا بدتمیز، حد درجہ کا تعلّی پسند، حد درجہ کا نٹ کھٹ، یہ باتیں

بھی صحیح ، جو میں نے عرض کیا وہ بھی صحیح ، اس کا رویہ ، ہر شخص کے مزاج اور پھر اوصاف کے مطابق ہوتا ہے ۔

باقی رہا میری نالائقیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ، مجھ سے کیوں تعظیم کے ساتھ پیش آتے ہیں ؟ میں تو اسے ان کی ذاتی شرافت ہی کا نام دوں گا - آپ بے شک اسے ان کا کمال نہ گردانیں - خاندانی شرافت کا نام دے لیں - بہر حال جس کی جھولی میں جو کچھ ہوتا ہے برآمد بھی وہی کچھ ہوتا ہے - یہ الگ بات ہے کہ یہ اپنی جھولی کی طرف کم ، دوسروں کی جھولیوں کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں ۔

یہ اخبار نویس ہیں یا ادیب ، میں اس کا آج تک فیصلہ نہ کر سکا - ویسے آج کی محفل میں اس کا فیصلہ ہو ہی جانا چاہیے - اگر آج یہاں اخبار نویس زیادہ ہیں تو یہ اخبار نویس اور اگر ادیب زیادہ ہیں تو یہ ادیب ! یہ فیصلہ کچھ ویسا ہی فیصلہ ہے کہ ایک بار میں نے خدیجہ مستور سے پوچھا تھا - بلبل مذکر ہے یا مؤنث ؟ ان کا جواب یہ تھا - اگر سوال کرنے والا مرد ہو تو مذکر ، عورت ہو تو مؤنث !

بہر حال ادیب عوام کے دلوں میں بستا ہے اور تاریخ کی کتابوں میں بولتا ہے مگر صحافی خواص کے دلوں میں بستا ہے اور حکومت کے ایوانوں میں بولتا ہے - میں تو اسے اپنا اپنا منصب اور اپنی اپنی قسمت کہوں گا - آپ چاہیں تو اسے اپنی اپنی قسمت اور اپنا اپنا منصب کہہ لیں - بات یوں بھی ایک ، ووں بھی ایک ، کیونکہ چھاچھ کے ایک گلاس میں پانی کے دس گلاس ڈال دیجیے جب بھی چھاچھ ہی کہلائے گی ۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں عطاء الحق قاسمی کو نہیں جانتا - یہ جاننا بھی کیا جاننا ہوا کہ کہہ دوں - موٹے موٹے سے ناک نقشے والا عطاء الحق قاسمی ، متجسس آنکھیں اور بیدار ذہن

والا عطاالحق قاسمی، ہنسنے اور ہنسانے والا قاسمی، محبّت کرنے اور لڑنے مرنے والا قاسمی۔ بہرحال یہ شخص مجھے تو اچھا نہیں لگتا۔ مجھے تو خوبصورت بھی نہیں لگتا۔ اگر کسی کو اچھا لگے ہے یا خوبصورت لگے ہے تو مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں بلکہ سبحان اللہ، بہرحال وہ نظر کہ جسے عطا خوبصورت لگتے ہوں وہ نظر کسی مجھ جیسے عام آدمی کی نہ ہو گی بلکہ وہ کوئی خاص نظر ہو گی اور مجھے معلوم ہے کہ خاص نظریں ہیں۔ بھلا دُنیا والوں کو کیا مصیبت، کہ وہ بنیاد کے بغیر عمارت کھڑی کر دیں!

یقین کر لیجیے۔ میں نے ان کی کتاب بھی نہیں پڑھی۔ یہ الگ بات کہ گزشتہ چھ برسوں سے ان کے کالموں کو جھیلتا چلا آ رہا ہوں۔ اگر پڑھنا نہیں چاہتا تو پڑھتا کیوں ہوں؟ اس کا جواب کیوں دوں؟ اس کا جواب آدم کے پاس بھی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ دانۂ گندم کے قریب نہ جانا، مگر وہ گیا۔ ان کے بھی کالموں میں ترغیب کا عنصر کچھ ایسا ہے کہ وقت ملے یا نہ ملے۔ وقت نکالنا پڑتا ہے۔ ان کا فن تلخ سے تلخ بات کو، سلیقے سے کہنے کا فن ہے۔ ان کے بیشتر کالم سیاسی ہوتے ہیں مگر وہ سیاسی لوگوں کو بھی سیاسی نہیں لگتے۔ ان کے کالم نہ ہوئے غزل کے شعر ہو گئے۔

ان کی کتاب میں ۶۱ کالم ہیں جو ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک کے درمیانی عرصہ میں لکھے گئے۔ ۶۱ کالموں کے بارے میں جو حضرات باتیں کریں گے انھیں لوگ نقاد کہیں گے۔ جو لوگ تین چار کالموں کی بات کریں گے انھیں لوگ شرفا میں سے کہیں گے اس لیے کہ وہ خود بھی سوچتے ہیں۔ دوسروں کو بھی سوچنے کا موقع دیتے ہیں۔

ادب کے سفر میں کسی کو خوش یا کسی کو ناراض کرنے کا کوئی چلن نہیں۔ اگر کوئی کسی کو وقتی طور پر خوش کرے گا تو اس سے آنے والے لوگ ناراض بھی ہو سکتے ہیں اور اگر

کوئی کسی کو وقتی طور پر ناراض کر سکتا ہے تو ہو سکتا ہے آنے والے لوگ بہت خوش ہوں۔

ادب ہیں جن لوگوں کو امان ملے گی۔ وہ وہی لوگ ہوں گے جو سچے ہوں گے۔ جو سچے اکھر لکھیں گے۔ جو سچے فقرے لکھیں گے۔ میرے نزدیک ایک ایسا ہی سچا فقرہ یہ ہے کہ ادب کے میدان میں بڑے گھپلے ہوئے اور دوسرا سچا فقرہ بھی یہ ہے کہ ادب کے میدان میں بڑے گھپلے ہوئے۔

اگر مجھے عطا سے محبت ہے۔ اس کے قلم کی جنبشوں سے لگاؤ ہے تو پھر مجھے تحسین وستائش کے ماتھے پر، ایک کالی بندیا لگانا ہی ہوگی۔ یہ مسئلہ جدا ہوگا کہ بندیا بھی خوبصورت نگینے لگ جائے۔ ایسے میں نہ آپ کچھ کر سکیں گے نہ میں! بلکہ صبر شکر!

میں نے ان کا ایک کالم ۹ ستمبر ۱۹۷۶ء کو پڑھا تھا جو بین الاقوامی سیاست پر تھا۔ وہ براہِ راست "جمع کا سوال" نہ تھا۔ یعنی دو اور دو چار والا کالم نہ تھا۔ بلکہ "تفریق کا سوال" تھا کہ فلاں فلاں ملک کہاں کھڑا ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں۔ وہ کالم بڑی رقم میں سے چھوٹی رقم کو تفریق کرنے کا تھا۔ اس کالم کا نام "طوطے ہی طوطے" تھا۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو سارا کالم سنا دوں۔ مگر طوالت کے خوف سے صرف چند سطریں!

"میں نے تعجب سے ایک نظر طوطوں کو اور پھر ان کے مالک کو دیکھا۔ مالک ہنس رہا تھا۔ طوطے بھی ہنس رہے تھے۔ میں نے اپنی حیرت پر قابو پالیا اور کہا۔ یہ طوطے ہم انسانوں کی باتیں سمجھتے ہیں اور ہم انسانوں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ مالک نے بتایا۔ یہ طوطے معمولی طوطے نہیں، ذہین طوطے ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی طوطے ہیں۔ کچھ ادبی اور صحافتی طوطے ہیں۔ انقلابی طوطے ہیں اور اسلام پسند طوطے ہیں۔ یہ سب دانا جانور ہیں! میں نے یہ سُن کر اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ اگر یہ

اتنے ہی دانا ہیں تو انھوں نے تمہاری غلامی کس طرح قبول کر لی ؟" آقا نے جواب دیا۔ میں تو محض ان کا رکھوالا ہوں۔ یہ میرے غلام نہیں۔ میں تو خود غلام ہوں۔ یہ دیکھو"! یہ کہہ کر اُس نے اپنی پُشت پر سے کپڑا اُٹھایا۔ جس پر غلامی کا داغ موجود تھا۔

"تم کس کے غلام ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں جس کا غلام ہوں وہ آگے کسی کا غلام ہے اور یہ سلسلہ بہت دُور تک چلا گیا ہے"۔

بین الاقوامی سیاست پر، اس سے بہتر تبصرہ اور اس سے بہتر انداز میں لکھنا شاید کسی کے بھی بس کی بات نہ ہو۔ یہ کالم کہہ رہا ہے کہ لکھنے والے پر ایمان لے آؤ۔ مگر ہم نے پہلے کسی کو مانا ہے جو اس کے قلم کا لوہا مانیں۔ اپنی جو رائے تھی عرض کر دی مگر ایمان لے آئیں۔ یہ ناممکن! اپنا تشخص غارت ہو جائے گا۔

دوسرا کالم ہم نے ۲۴ جون ۱۹۷۰ء کو پڑھا تھا سفید پوشوں کا جو حال اس دَور میں ہے۔ یہ کالم اس کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہم جینا چاہتے ہیں مگر جی نہیں سکتے۔ ہم مرنا چاہتے ہیں، مر نہیں سکتے۔ کیوں کہ ہمارے مسائل ہمیں زندہ رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر دُنیا کو کسی طرح سے، ان کے مسائل سے چھٹکارا مل سکتا تو آدھی دُنیا مرنے پر راضی ہو گئی ہوتی۔

دیکھئے دو سفید پوش باتیں کر رہے ہیں:

"اوسط درجے کا مکان بھی تعمیر کیا جائے تو کم از کم ڈیڑھ لاکھ روپے لگتے ہیں"۔

"پھر تم نے کیا سوچا ؟"

"ساٹھ ہزار روپے ہاؤس فنانس کارپوریشن والوں سے قرض لے لوں گا"۔

"اور باقی؟"

"تقریباً پندرہ ہزار روپے کی مالیت کے زیورات ہیں۔ کچھ قرض یہ زمین رہن رکھنے کی صورت میں مل جائے گا۔"

"دس ہزار یہ ہو گئے باقی؟"

"سکوٹر بیچ دوں گا۔"

میں نے سکوٹر کی ہیئت کذائی مدِ نظر رکھی اور کہا۔ دو ہزار روپے ۔ باقی؟

اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں اور پھر اس نے چٹکی بجا کر کہا۔ کچھ رقم تم سے قرض لے لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔" سو روپیہ ہو گیا۔ باقی؟"

"تم ٹوٹل لگاؤ۔" اس نے بیزار ہو کر کہا۔" پہلے دیکھیں یہ رقم کتنی بنتی ہے؟"

"بہتّر ہزار ایک سو!"

"مزید کتنی رقم درکار ہے؟"

"ٹھیک ہے انتظام ہو جائے گا۔" اُس نے اچانک پُراُمّید ہو کر کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"میں لائف انشورنس کرا لوں گا۔"

"مگر اس سے مکان کیسے بنے گا؟"

"بن جائے گا۔ اس نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ انشورنس کرانے کے بعد میں خود کشی کر لوں گا۔ میں نہیں تو میرے بچّے اپنے مکان میں رہیں گے۔"

اس گفتگو میں شریک تو دو آدمی ہیں، کوئی سے دو شخص۔ مگر اس کی ندمیں پُورا

ملک ہے۔ سسکنے کی یہ آواز صرف دو آدمیوں کی نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی ہے۔

یہ کالم لکھ کر عطا نے کلیجہ پہ ہاتھ ڈالا ہے پہلے جراحتیں کیا کچھ کم تھیں جو اور کچوکے لگائے۔ یہی وجہ ہے کہ میں قاسمی کی تحریروں کو پسند نہیں کر سکتا۔ پسند کروں گا تو یہ زندہ درگور کر دے گا۔ یہ شخص خود امر ہو جائے گا مگر دوسروں کو مار ڈالے گا۔ سفّاک کہیں کا۔

یہ شخص رونے رُلانے پر ہی قادر نہیں۔ رونے والوں کو ہنسانے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ یہ عجیب طرح کا آدمی ہے۔ اس کا کوئی ایک رُخ نہیں۔ ابھی کہہ رہا تھا۔ روؤ اور خُوب روؤ۔ ابھی کہہ رہا ہے ہنسو اور خُوب ہنسو!

ابھی عطا سفید پوشوں کا نوحہ پڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ گدگدانے بھی لگا۔ سفید پوش کی تعریف وہ یوں بھی کرے گا۔ "سفید پوش" وہ ہے جو ماسی برکتے کے تندور سے کھانا کھا کے نکلے اور ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے باہر خلال کرتا پایا جائے"۔

عطا خود بھی ظالم ہے اور اس کا قلم بھی ظُلم ڈھاتا ہے۔ وہ لمبے چوڑے مضامین باندھ کر، اپنے مدُعا تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ وہ قاری کا ایک ہی وار میں دھڑن تختہ کر دیتا ہے اس کا قلم اُسترے کی دھار نہیں بلکہ بلیڈ کی دھار ہے۔ دیکھئے وہ دو سطروں میں بات کر رہا ہے:

"عینک ایک ایسی چیز ہے جو اگر بصیرت نہیں تو بصارت ضرور دیتی ہے اور موجودہ دَور میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ انسان بصیرت کی بجائے بصارت سے کام کرے"۔

عطا کی کتاب (روزنِ دیوار سے) میں ایسے ایسے حکمت آمیز اور چودہ طبق

روشن کرنے والے جملے بکھرے پڑے ہیں۔ یہ میرا قیاس ہے۔ چونکہ میرا اس کتاب کو سطر بہ سطر پڑھنے کا ارادہ نہیں، ارادہ ہے تو فرصت نہیں، فرصت ہو تو بھی ارادہ نہیں۔ کون آئندہ اس سے جُھک کے ملے! جو خورد ہو، وہ ادب میں بزرگ بن جائے۔ مجھے منظور نہیں۔

غالب نے بھی اپنی تاریخِ وفات کہی تھی۔ مگر تاریخ گزرتی رہی اور وہ اس دُنیا میں دندناتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کو ایک بار نہیں۔ دو تین بار اپنی تاریخِ وفات کہنی پڑی۔ سعادت حسن منٹو نے بھی اپنا کتبہ خود لکھا تھا جو ان کی قبر پر موجود ہے۔ عطا نے بھی اپنے بارے میں خود ہی سب کچھ لکھ ڈالا ہے۔ واقعی بڑی خوبیاں تھیں اپنے یار میں! وہ دوستوں کا دشمن تھا اور دشمنوں کا دوست، یہ وصف پیغمبرانہ ہے۔ دشمنوں کے لیے دل میں کشادگی، اپنے لیے یا دوستوں کے لیے ضابطے، کڑے ضابطے۔ اپنے بیٹے کے لیے حضرت عمرؓ کا یہ کہنا۔ لگا دو کوڑے، اس لیے کہ اس نے جُرم کیا ہے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مرحوم عطاالحق قاسمی کے بارے میں بھی اپنے تاثرات کا اظہار کرتا۔ چونکہ وہ خود اپنے بارے میں لکھ گئے ہیں۔ اس لیے زیادہ مستند ان کا لکھا، ویسے میں اُن کا اپنے بارے میں لکھا ہوا کالم سامنے لانے کے بعد، سوچوں گا کہ میں اب کیا کروں۔ کیا لکھوں؟ فرما گئے ہیں:

> "انھیں تصنّع، بناوٹ، منافقت اور نظریاتی دھوکہ بازی سے شدید نفرت تھی اور ایسے لوگوں کو دیکھ کر ناک پر رومال رکھ لیتے تھے۔ چنانچہ انھیں اکثر اسی حالت میں پایا گیا۔ مرحوم کو دوسروں کے بارے میں کڑوی سے کڑوی سچّی بات ان کے مُنہ پر بیان کرنے کا بہت شوق تھا اور یوں وہ بڑے حق گو تھے۔ تاہم اپنے بارے میں دوسروں کو ہمیشہ حُسنِ ظن

سے کام لینے کی تلقین کرتے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی ان کے بارے میں سچی بات کہہ دیتا تو گھنٹوں آزردہ رہتے کہ لوگوں میں کھرے کھوٹے کی پہچان نہیں رہی۔ مرحوم سکھوں کے شہر امرتسر میں پیدا ہوئے۔ اس کا اندازہ ان کی بعض عادات سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ کسی انتہائی ناخوش گوار واقعہ سے دوچار ہونے کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے گھر واپس آجاتے تھے لیکن کئی گھنٹے بعد اور بعض صورتوں میں کئی دنوں بعد اچانک اُنھیں خیال آتا تھا کہ اُس روز تو اُن کی سخت توہین ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ پیچ و تاب کھانا شروع کر دیتے تھے۔ ان کی محبّت اور نفرت بھی عجیب قسم کی تھی۔ کسی دوست کی غیر دوستانہ حرکت پر ان کی نفرت انتہائی شدید لیکن عارضی نوعیت کی ہوتی تھی۔ جب کہ ان کی محبّت دھیمی دھیمی لیکن دائمی تھی۔ آخر عمر میں اُنھوں نے خلافِ عادت اس فیلڈ میں شدت اور پائیداری کا بیک وقت مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں وہ ہر وقت دردناک اشعار پُرسوز لَے میں گاتے پائے گئے حتیٰ کہ اسی عالم میں وفات پائی۔"

دیکھا آپ نے "مرحوم" نے اپنا نوحہ کس انداز اور کس شان سے لکھا۔ میں خوبصورت نثر کو بھی بہ زمرۂ نظم ہی سمجھتا ہوں۔ اسی لیے مندرجہ بالا سطور کو نوحہ کہا۔ بہ ظاہر یہ سطریں بڑی مفرح ٹائپ کی ہیں۔ مگر بباطن مفہوم درد انگیز ہے۔ جو شخص اپنے آپ پر ہنس سکتا ہو کیا آپ اسے معمولی آدمی سمجھتے ہیں؟ میرے نزدیک کسی بھی مصنّف کے لیے مشکل ترین مرحلہ وہ مرحلہ ہوتا ہے کہ جب اُسے گفتگو اپنے بارے میں کرنا ہو۔ سو "مرحوم" اس مرحلے سے بھی سُرخرو نکلے۔ اپنے بارے میں جو کچھ لکھا، سچ لکھا اور یہ بھی سچ ہی لکھا حتیٰ کہ

اسی عالم میں وفات پائی۔"

یہ کالم کہ جس میں عطا نے وفات پائی تھی، ۶ رجنوری ۱۹۷۶ء کو لکھا گیا تھا۔ مگر مجھے بذریعہ ٹیلی فون ۱۸ رمئی ۱۹۷۸ء کو یہ کہا "طفیل صاحب میری کتاب کی تقریب ۲۶ رمئی ۱۹۷۸ء کو ہو رہی ہے۔ اس میں آپ بھی مضمون پڑھیں۔ میں نے جواب میں کہا "اصولاً مجھے کوئی عذر نہیں۔ بس معاملہ توفیق کا ہے۔"

کہنے لگے "آپ کے لیے کیا مشکل ہے۔ قلم پکڑیں اور گھسیٹ ڈالیں۔"

میں نے کہا "اگر میں آپ کی طرح کا لکھنے والا ہوتا تو ایسے ہی کرتا۔"

اس کے باوجود عطا کا اصرار تھا کہ مضمون لکھوں۔ معاملہ ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ ایک دن ڈاک میں اس تقریب کا دعوت نامہ آگیا۔ اس میں میرا نام چھپا ہوا تھا۔ یقین جانیے خاصا پریشان ہوا۔ لکھنا میرا مشغلہ سہی مگر میں ہر "ایرے غیرے" پر مضمون نہیں لکھتا۔ تیل دیکھتا ہوں۔ تیل کی دھار دیکھتا ہوں۔"

ابھی میں تیل کی دھار کو اپنے دماغ پر محسوس کر ہی رہا تھا کہ پھر عطا کا ٹیلی فون آیا۔ اس نے بتایا "ہو سکتا ہے کہ تقریب کے صدر تشریف نہ لا سکیں۔"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

کہنے لگے "ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے۔"

اس پر میں نے کہا "اور کراؤ تقریب!"

دورانِ گفتگو عطا نے یہ بھی بتایا کہ "زخم خوردہ تو میں بھی ہوں۔"

میں نے پوچھا "خیر باشد؟"

"آہا ہا، دو چار دن ہوئے کہ میرے بہنوئی کا بھی انتقال ہوا ہے۔"

جواب میں مَیں نے کہا "خدا کے لیے اس تقریب کے ملتوی کرنے کا اعلان کر دو ورنہ کسی دوسرے مضمون نگار کا بھی انتقال ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی مشورہ بھی دیا۔ بہ طور صدقہ بکرے وکرے دو!"

کہنے لگے "مضمون نگار بکرے ہی تو ہوتے ہیں۔"

عطا اُٹھتے بیٹھتے مسکراتے رہتے ہیں۔ گفتگو ہر طرح کی کرتے ہیں۔ زنانہ، مردانہ دونوں طرح کی، مگر ایک شائستگی کے دائرے میں، یہ غموں اور دُکھوں کو اپنے اوپر وارد نہیں کرتے۔ بلکہ جھٹک دینا چاہتے ہیں۔ دُکھوں میں مسکرانا بڑے حوصلے کی بات ہے صاحب!

ابنِ انشا کا جس دن انتقال ہوا۔ اُس دن عطا میرے پاس آئے۔ کہنے لگے۔ "کوئی خبر سُنی؟"

میں نے کہا "کیسی خبر؟"

کہنے لگے "آج صبح ریڈیو نے بتایا کہ ابنِ انشا کا انتقال ہو گیا ہے"۔ اتنا سا فقرہ کہتے ہوئے بھی ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

مجھے معلوم تھا کہ عطا کی ابنِ انشا کے ساتھ دوستی نہ تھی۔ لمبی چوڑی ملاقاتیں نہ تھیں۔ بس رسمی سے تعلقات تھے۔ مگر وہ روئے کیوں؟ اُن کی آواز گلوگیر کیوں ہوئی۔ معلوم ہوا دوستی اہلِ قلم کے لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اہمیت فن کی ہوتی ہے اہمیت جوہرِ ہُنر کی ہوتی ہے۔

چنانچہ رائٹرز گلڈ نے بھی ابنِ انشا کے سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیا، تاکہ خراجِ عقیدت پیش کیا جائے۔ عطا کو بھی مضمون پڑھنے کے لیے کہا۔

سارے مضمون نگار آ گئے۔ مگر عطاالحق قاسمی نہ پہنچے۔ جب تقریب ختم ہو گئی تو ان کی صورت نظر آئی۔ میں نے شکایت کی "جناب! وقت پر کیوں نہیں پہنچے؟" کہنے لگے:

آہاہاہا! اباجی کے دانتوں میں سخت درد تھا۔ دو چار دن سے بیکل تھے۔ بالآخر آج دو دانت نکلوانے پڑے۔ دوسرے میرے بیٹے یاسر کو ۱۰۴ بخار تھا۔ اس لیے حاضر نہ ہوا۔ آہاہاہا!

اب آپ ہی بتائیں کہ ایسے ہنسوڑ پر کوئی مضمون کیا لکھے۔ بہنوئی کا انتقال ہو گیا تو آہاہاہا، والد گرامی کے دو دانت نکل گئے تو آہاہاہا، بچّے کو ۱۰۴ بخار ہے تو آہاہاہا!

یقین جانیے میں نے ایسا حوصلے والا شخص اور کوئی نہیں دیکھا کہ جو ایک ادیب کے انتقال کی خبر سُن کر رو سکتا ہو اور اپنے غموں پر ہنس سکتا ہو۔ حالانکہ اطلاع یہ ہے کہ لوگ دوسروں کے غموں پر ہنستے ہیں اور اپنے غموں پر روتے ہیں۔

عطا صرف دوسروں پر ہی فقرے چُست نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کسی کو شرافت کی سند دی جا سکتی ہے۔

عطا نے مجھے ایک گروپ فوٹو دکھایا اور مجھ سے پوچھا "ان میں سے اس شخص کو جانتے ہیں؟"

وہ صاحب بڑی رُعب دار مونچھیں لگائے کھڑے تھے۔ میں نے کہہ دیا "نہیں جانتا۔"

کہنے لگے "یہ میں ہوں۔"

"اور یہ مونچھیں؟"

کہنے لگے "جب میں ادب اور صحافت کی طرف مڑا تو میں نے پہلا کام یہ کیا

کہ مونچھیں منڈوا دیں "

"کیوں ؟"

" وہ اس لیے کہ کہیں کوئی دوسرا نہ منڈوا دے "۔

جو شخص اتنے رکھ رکھاؤ اور اتنی سوجھ بوجھ کے ساتھ ادب کی طرف آیا ہو۔ وہ اب اس میدان سے ہٹے تو کیونکر ہٹے۔ وہ تو ڈنکے بجائے گا۔

کئی لوگ اپنی زبان سے، اپنی مدح میں اتنا کچھ کہتے ہیں کہ اُن کی زبان کا اُوپر والا حصہ خاصا گِھسا ہوا ہوتا ہے۔ مگر یہ اپنی لیاقت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔ اپنی مدح میں کچھ نہیں کہتے۔ ایک پیارا سا طالب علمانہ روّیہ ہے (حالانکہ خود پروفیسر ہیں) جو لوگ اپنی ہمہ دانی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اُن کے بارے میں چراغ حسن حسرت نے ایک بڑا خوبصورت کالم لکھا تھا۔ اس میں سے چند سطریں!

" مولوی شفیع داؤدی مرحوم صرف نام کے مولوی تھے یعنی عربی نہیں جانتے تھے۔ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں انھیں ولایت جانا پڑا۔ جہاں وہ علامہ اقبال کے ساتھ رہے اور انہی کے ساتھ واپس آئے۔ جہاز عدن کے قریب پہنچا تو مولوی صاحب عرشہ پر کھڑے سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً وہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کے سمندر میں جا پڑی۔ عدن میں غوطہ خوروں کی کثرت ہے۔ سمندر میں کوئی چیز پھینک دیجیے۔ یہ لوگ غوطہ مار کے نکال لائیں گے۔ مولوی صاحب نے چلّا کے کہا " یا شیخ، ذالک الکتاب لاریب فیہ "۔ ایک غوطہ خور ان کا مطلب سمجھ گیا اور رپورٹ نکال لایا "

عطاالحق قاسمی کے دو بیٹے ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام یاسر ہے اور چھوٹے کا نام عمر، عمر بھی علی الترتیب تین اور چار سال!

عطا نے سوچا کہ ہم بچّوں کو بجائے اس کے کہ سکھّوں کے لطیفے سنائیں، جنّوں اور پریوں کے قصّے سنائیں بہتر یہ ہو گا کہ اساتذہ کے شعر یاد کرائیں۔ چنانچہ کبھی میر کا کوئی آسان سا شعر سُنا دیا کبھی غالب کا!

ایک دن، اُنھوں نے اپنے بڑے بیٹے یاسر سے پوچھا "عُمر کہاں ہے؟"

یاسر نے جواب دیا "ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے"۔

تھوڑی دیر کے بعد، پھر پوچھا "کیا ابھی تک عمر سو رہا ہے؟"

تو یاسر نے جواب دیا "ابھی ٹک روتے روتے اُٹھ گیا ہے"۔

بچّے شعر یاد کرتے رہے۔ موقع بہ موقع، کبھی برمحل اور کبھی بے محل ان کا استعمال بھی کرتے رہے۔ مگر ایک دن حد ہو گئی۔

عطا اور ان کی بیگم کی، کہیں جلد پہنچنے کے سلسلے میں، قدرے تلخ لہجے میں گفتگو شروع ہو گئی۔ ننّھا یاسر یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا "شرم تم کو مگر نہیں آتی"۔

یہ تو طے ہے کہ آج کے بچّے، پہلے بچّوں سے زیادہ ذہین ہیں۔ مگر ایسے بقراط بچّے یہ ایسے سقراط بچّے، جو معصومیت کے باوجود ایسے نکتہ شناس ہوں کہ کوئی نکتہ باقی نہ چھوڑیں کم ہوں گے۔ میں تو اب ان کے گھر جاتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔ مبادا پوچھ لیں۔ "نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا!"

غرض بچّے بڑے ہو کر، ہم بزرگوں کا کیا حال کریں گے۔ نہیں معلوم! اگر عطا کی آنکھ کی شرم باقی ہے۔ اگلے زمانے کی شرافت موجود ہے۔ حفظِ مراتب کا احساس باقی

ہے۔ ہوا یوں کہ ایک تقریب میں، عطا نے مضمون پڑھنا تھا۔ میرا نام بھی اس تقریب کے مضمون نگاروں میں شامل تھا۔ مگر عطا سے پہلے مجھے بلا لیا گیا۔ اس معمولی سی بات کو عطا نے محسوس کیا کہ مجھ سے پہلے طفیل کو مضمون نہیں پڑھنا چاہیے۔ چنانچہ میری بجائے عطا سٹیج پر پہنچ گئے اور کہا کہ "پہلے میں مضمون پڑھوں گا"۔

بہ ظاہر یہ چھوٹی سی بات ہے۔ مگر یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حاضرین نے تالیاں بجا کر عطا کے اس جذبے کی تعریف کی۔ میرے دل میں بھی ان کا مقام بڑھ گیا۔

قصّہ مختصر! میں عطاالحق قاسمی پر، باوجود مداح ہونے کے مدلّل مداحی قسم کا مضمون نہ پڑھ سکا۔ چونکہ قاسمی کا خیر خواہ ہوں اس لیے اس کے کان میں صرف دو جملے کہوں گا۔

پہلا جملہ! ـــ تیری تحریر میں بانکپن ہے اس کے علاوہ کچھ نہ سمجھنا۔

دوسرا جملہ! ـــ تیری شخصیت میں موہنی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ سوچنا۔

محمد طفیل کی چند "اور تخلیقات"

نقوش — افسانہ نمبر

نقوش — غزل نمبر

نقوش — خطوط نمبر

نقوش — شخصیات نمبر

نقوش — طنز و مزاح نمبر

نقوش — آپ بیتی نمبر

نقوش — مکاتیب نمبر

نقوش — لاہور نمبر

نقوش — ادبِ عالیہ نمبر

○

نقوش — میر نمبر

نقوش — غالب نمبر

نقوش — اقبال نمبر

نقوش — پطرس نمبر

نقوش — منٹو نمبر

نقوش — شوکت نمبر

مصنّف کی کتابیں

○ صاحب ○ جناب ○ آپ

○ محترم ○ مکرّم ○ معظّم

اور مجتبیٰ